ابنِ جُبیر کا سفر

تلخیص و ترجمہ

مُحمّد خالد اختر

toobaa-elibrary.blogspot.com

toobaa-elibrary.blogspot.com

ترتیب

غرناطہ سے مکّہ معظمہ	۹
قیامِ مکّہ معظمہ	۳۹
حج بیت اللہ	۶۳
قیام مدینہ منوّرہ	۸۷
مدینہ منورہ سے بغداد	۱۰۴
بغداد سے دمشق	۱۲۷
دمشق۔ جنت بلادِ اسلام	۱۴۵
قیام دمشق	۱۶۰
مسیحی شام میں	۱۷۵
مکہ سے سسلی اور مسینہ	۱۹۱
مسینہ (سسلی) سے المدینہ اطرابنش اور غرناطہ	۲۰۹

toobaa-elibrary.blogspot.com

پیش لفظ

پینتیس سال پہلے کی بات ہے کہ ابنِ جُبیر کے سفرنامے کا انگریزی نسخہ اپنے اچھے دوست شفیق الرحمان کے توسط سے میرے ہاتھ لگا۔ قرونِ وسطیٰ کے اس ہسپانوی عرب Moor کی سفری رُوداد کو ایک صاحب جے۔ سی براڈ ہرسٹ نے ۱۹۵۱ء میں عربی سے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ ایسی انگریزی میں جو مصنف کے مسجّع و مرصّع اسلوب، الفاظ کی بندش اور اُن کی امیجری کو نہایت خوبی سے ادا کرتی ہے۔ اِدھر میں ایسے لوگوں میں سے ہوں جو رومان کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں اور قدیم تذکروں، پہلے وقتوں کی حکایتوں اور ماضی کے انوکھے مسوّدوں پر جان دیتے ہیں۔ ہیروڈوٹس، اگزونوفان اور مارکوپولو کو میں نے زیادہ نہیں تو کم از کم آدھ درجن بار ضرور پڑھا ہے، اور اتنی بار پڑھنے کے باوجود میری طبیعت ان سے بھری نہیں۔ میرے اس ذوق کی ایک وجہ تو غالباً یہ ہے کہ میں ناقابلِ علاج حد تک رومانی ہوں، اور دوسرے یہ کہ اُن سب لوگوں کی طرح جو جذباتی طور پر بڑے نہیں ہوتے ہیں ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنا اور کھویا رہنا پسند کرتا ہوں۔

ابنِ جُبیر کا سفرنامہ میں نے بڑے انہماک اور حیرت سے پڑھا۔ اس بوڑھے اُندلسی عالم اور سیّاح نے میرے دل کو بالکل موہ لیا، اور میں اس کی سادہ، متین اور پُرکشش شخصیت کے جادو تلے آگیا۔ میں نے ایسی کتاب پہلے کبھی نہ پڑھی تھی۔ اپنے دوست شفیق الرحمان کے اُکسانے پر میں نے ابنِ جُبیر کی کہانی کچھ

۱؎ Travels of Ibn-e-Jubyr شائع کردہ گبز میموریل - لندن

اس کی اور کچھ اپنی زبانی کہنے کا ارادہ باندھا۔ اُس وقت نہ مجھے اور نہ ہی شفیق کو اس بات کا علم تھا کہ ابنِ جُبیر کا اُردو ترجمہ برسوں پہلے نولکشور پریس سے طبع ہو چکا ہے، ورنہ میں اس کام کا بیڑا نہ اُٹھاتا۔ کتاب کے مکمل ترجمے کی طرف میرا خیال نہ گیا، کیونکہ وہ بڑی جان جوکھوں کا کام تھا اور میں سمجھتا تھا کہ آجکل کے پڑھنے والوں کے لیے اس میں اتنی دلچسپی بھی نہیں ہوگی۔ میں نے یہی مناسب جانا کہ اس سفرنامے کی تلخیص اس طرح سے پیش کروں جس طرح اب آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔

ابنِ جُبیر کے اس تذکرے کو چھانٹنے، ترتیب دینے اور اس کا ترجمہ کرنے میں مجھے کم و بیش دو ماہ کا عرصہ لگا۔ میں روزانہ بلاناغہ آٹھ نو گھنٹے کام کرتا اور صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اس کام میں جُت جاتا۔ مگر مجھے اسے "کام" نہیں کہنا چاہیے، یہ تو ایک پُرلطف مشغلہ تھا جس میں میں بالکل کھو جاتا تھا۔ بُوڑھے اُندلسی کی رفاقت میں جتنا وقت بھی میں نے گزارا، وہ مسرت سے بھرپور تھا۔ آرام کرسی میں نیم دراز، حُقے کی نَے منہ میں ڈالے، ابنِ جُبیر کے سے عالم اور سُلجھے ہوئے ساتھی کی معیت میں بارھویں صدی کی پُرآشوب اور حیرت ناک اسلامی دنیا کی سیر کرنا ایک بے حد روح پرور تجربہ تھا۔ جب کتاب ختم ہوئی اور میں ابنِ جبیر سے اس کے شہر غرناطہ میں جُدا ہوا، تو میرا دل واقعی بھاری تھا۔ ان دو مہینوں میں یہ اُندلسی میرے لیے اتنا ہی حقیقی بن گیا تھا جتنا ایک عزیز ترین دوست اور اس سے بچھڑتے ہوئے مجھے سچ مچ کا رنج ہوا۔ اس تلخیص سے پہلے میں بہت کچھ لکھ چکا تھا، اور اس کے بعد بھی میں نے کافی چیزیں لکھی ہیں۔ لیکن یہ واحد کتاب ہے جسے میں نے 'محبت کے لیے' لکھا ہے۔ اصل لکھنے اور ترجمہ کرنے کے عمل میں مجھے شدید محنت کرنی پڑی، کیونکہ میں قدرتی یا پیدائشی لکھنے والا نہیں ہوں اور بڑی دقّت سے لکھتا ہوں۔

یہ تلخیص جب مکمل ہوئی تو اس کا مسوّدہ برسوں میرے میز کی دراز میں پڑا رہا۔ مَیں چاہتا تھا کہ یہ چھپ جائے، لیکن بظاہر اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کے لیے شاید کوئی ناشر نہ مل سکے گا۔ پھر اس کے چھپنے کے بارے میں مجھے کوئی زیادہ فکر بھی نہ تھی۔ یہ کتاب چھپنے کی خاطر لکھی ہی نہیں گئی تھی۔ یہ تو ایک خوشی کی مشقت Labour of Love تھی، اور اسے لکھتے ہوئے ایک سرشار کرنے والی خوشی کی صورت میں مجھے اپنا صلہ مل چکا تھا۔ جب میں ۱۹۶۲ء کے اوائل میں تبدیل

ہو کر لاہور آیا (ایک شہر جس سے میں نے ہمیشہ محبت کی ہے) تو ایک شام مکتبہ جدید میں بیٹھے ہوئے میں نے اپنے دوست حنیف رامے سے اپنی اس تلخیص کا ذکر کیا۔ حنیف نے اس سفرنامے میں دلچسپی کا اظہار کیا، اور بالآخر طے یہ ہُوا (اور یہ میری اپنی تجویز تھی) کہ کتاب کو پہلے اقساط کی صورت میں مکتبہ کے ماہنامے "نصرت" میں چھاپا جائے، اور بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے، میرے لیے یہ ایک اچھی خبر تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں اپنے نام کو چھپا ہُوا دیکھنے کے لیے بے قرار تھا (خود نمائی کے ان معصوم اور بے ضرر جذبوں سے افسوس، میں ایک مدّت سے گزر چکا ہوں) بلکہ اس لیے کہ میں چاہتا تھا دوسرے بھی ابنِ جُبیر کی پُرکشش اور محبت کے لائق شخصیت سے جان پہچان پیدا کر لیں۔ اس طرح یہ تلخیص پہلے ماہانہ قسطوں میں "نصرت" میں چھپنی شروع ہوئی، اور گیارہ قسطوں میں جا کر مکمل ہوئی۔ اس وقت تک ماہنامے کے کئی پڑھنے والوں کو صبر کی تاب نہیں رہی تھی، اور اس کے مدیر کو دو تین خطوط اس مضمون کے موصول ہوئے کہ اس سلسلے کو ختم ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ دراصل ایک کتاب کو قسطوں میں ایک مقبول ماہنامے کے صفحات پر چھاپنا سراسر غلطی ہے۔ ماہنامے کے خریدار ایک ہی عنوان کو بار بار دیکھ کر اُکتا جاتے ہیں اور کراہنے لگتے ہیں۔ خود میری عادت یہ ہے کہ قسطوں والے سلسلے سے کنّی کتراتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ "نصرت" میں ابنِ جُبیر کی اشاعت نے اس ماہنامے کی قدر و قیمت میں رتی بھر بھی اضافہ کیا ہوگا۔

اب ابنِ جُبیر کے کتابی شکل میں چھپنے کا مرحلہ تھا، لیکن اس کام کی نہ ہی مجھے اور نہ میرے ناشروں کو جلدی تھی، اس لیے یہ ملتوی ہوتا گیا۔ اتنے میں اس پوری کتاب کا اُردو ترجمہ شائع ہو کر بازار میں آ گیا، اور اسے دیکھتے ہی میرا دل ڈوب گیا (اس میں ایک داڑھی والے چاق و چوبند ابنِ جُبیر کو ایک اُچھلتے ہوئے گھوڑے پر سوار دکھایا گیا تھا) مگر احمد علی صاحب کا ترجمہ، جتنا کچھ بھی میں دیکھ سکا عمدہ اور صاف تھا۔ لیکن شفیق الرحمٰن کا خیال تھا کہ اس ترجمے اور میری تلخیص میں وہی فرق تھا جو کرکٹ کے کھیل اور اس کی کمنٹری میں ہوتا ہے۔ اس نے میری ہمت بندھائی اور مجھے یقین دلایا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی اور میری تلخیص ایک خوبصورت چیز ہے۔ ایک اچھے دوست کی تعریف اور ہمت افزائی دنیا کی بڑی نعمتوں میں سے ہے اور اس نے مجھے کئی ایسے موقعوں پر سنبھالا دیا ہے جب میں رنج و مایوسی کے گڑھے میں دھنس چکا تھا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اگر یہ کتاب آج شائع ہو رہی ہے تو اس کا کریڈٹ سب سے بڑھ کر میرے عالم دوست محمد کاظم کو جاتا ہے۔ کاظم نے اس تلخیص کا موازنہ اصل عربی کتاب کے متن سے کر کے کئی ایک عربی ناموں کے املا کی تصحیح کی، اور مجھے بہت سے مفید اور قیمتی مشورے دیئے۔ "نصرت" میں چھپنے سے پہلے وہ ہر قسط کو اچھی طرح دیکھتا اور اسے نوک پلک سے سنوارتا تھا۔ کئی کئی صفحے جو کٹے پھٹے تھے، اُس نے محنت سے دوبارہ لکھے۔ اس کی مدد اگر اس کام میں شامل نہ ہوتی تو یہ کتاب غالباً کبھی نہ چھپ پاتی۔ اس کتاب کا انتساب کاظم کے نام اس کی اس محبت اور دلسوزی کا ہلکا سا صلہ ہے جس کی دراصل کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔

میں تلخیص کے بارے میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تقریباً نوے فی صدی ابنِ جُبیر ہے اور دس فیصدی مَیں! اگر آپ کو اس میں کوئی خوبی نظر آئے یا اس کے سادہ اور بے آرائش صفحات پر کوئی شعلہ بھڑکے تو اس کا سہرا ہمارے جادو نگار مُوری سیّاح کے سر ہو گا۔ میں تو فقط اس کا ایک حقیر شاگرد ہوں جس نے اس کی فصاحت و بلاغت کے چشمے سے جی بھر کے پیا ہے، اور اس سفرنامے کے جاودانی جادو کو اپنے بھونڈے الفاظ میں دوسروں تک پہنچانے کی جرأت کی ہے ـــــ اس لیے اس تلخیص میں جو خوبیاں ہیں وہ ابنِ جُبیر کی ہیں، اور جو کوتاہیاں اور خامیاں ہیں وہ سب کی سب میری ہیں!

محمّد خالد اختر

1

غرناطہ سے مکّہ معظمہ

ابنِ جُبیر کا سفرنامہ قرونِ وسطیٰ کی ان پُرکشش سرگزشتوں میں سے ہے جو ہماری خوش قسمتی سے وقت کے ہاتھوں تلف نہیں ہوئیں اور جن کا جادو کبھی نہیں مٹے گا۔ اس نے اس سفرنامے کو ۱۱۸۳ء اور ۱۱۸۵ء کے درمیانی عرصہ میں ترتیب دیا اور اس کا بیشتر حصّہ اپنے سمندر اور خشکی کے پُراز صعوبت سفر کے دوران میں سپردِ قلم کیا۔ یہ اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور پُرآشوب دَور تھا۔ ہسپانیہ میں باہمی خانہ جنگیوں کے باوجود ابھی تک شجاع اور متمدن مُوروں کے پاؤں جمے ہوئے تھے اور بیت المقدس کی فصیلوں پر سلطان صلاح الدین ایوبی کُل یورپ کے صلیبی عساکر سے نبرد آزما تھا۔ نصرانی یورپ تاریکی اور ابتلاء کی رات سے نکل کر رفتہ رفتہ تمدن اور تہذیب کے سویرے میں اُبھر رہا تھا۔ اس سفرنامے میں اُن وقتوں کی ایک ایسی مستند اور آنکھوں دیکھی رُوداد ملتی ہے جو بعد کے مؤرخین کی مفصّل تاریخوں میں نہیں مِل سکتی۔ مارکو پولو اور ابنِ بطوطہ کی طرح ابنِ جُبیر بھی ایک بڑا سیاح تھا۔ وہ اپنے تاثرات اور سفر کے واقعات ایک عالمانہ اور دلنشیں پیرائے میں بیان کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ اس کے صفحوں میں قرونِ وسطیٰ کا ایک مہذّب مسلمان، اپنے فکر و نظر، احساسات و جذبات اور ذہنی

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور اخلاقی انداز کے ساتھ پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ان حیرتناک اور عجیب واقعات کا رُو در رُو عینی مشاہدہ کرتا جاتا ہو۔ اس مستقل اور انوکھے احساس کے ساتھ کہ انسانی فطرت یا انسانی اداروں کی نوعیت ایک ہزار سال میں بھی نہیں بدلی۔ اینٹم کے زمانہ سے یہ مشابہت اور مماثلت ہمارے ذہن پر ایک عایت درجہ کا چونکا دینے والا اور آسیبی سا تاثر طاری کر دیتی ہے۔

ابنِ جُبیر غرناطہ کا متوطن ایک مُوری عرب تھا۔ وہ بلنسیہ کے ایک اچھے گھرانے میں پیدا ہوا۔ اپنی ذہانت اور خداداد قابلیت کی بدولت اس نے غرناطہ کے مُوری گورنر ابوسعید ابنِ عبدالمومن کی نگاہوں میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ گورنر نے اس کی کارکردگی سے خوش ہو کر اسے اپنے معتمد کی جگہ پر رکھ لیا۔ فروری ۱۱۸۳ء میں اپنے آقا سے حج بیت اللہ پر جانے کی اجازت حاصل کر کے اُس نے مسافت کا عصا ہاتھ میں تھاما اور غرناطہ کے ایک طبیب ابوجعفر احمد ابن حسین کی رفاقت میں اپنے مبارک اور کٹھن سفر پر روانہ ہوا۔ ایک پہر دن چڑھے وہ خچروں پر اپنے حسین و جمیل شہر کے دروازے سے باہر نکلے۔ راہ میں کئی ایک حصار بند مُوری شہروں میں پڑاؤ کرتے وہ بدھ کے روز اور قمری مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو سبتہ میں پہنچے۔ سبتہ سے وہ اسی دن جینوائی رومیوں کے ایک جہاز میں سوار ہو گئے جو اسکندریہ کی بندرگاہ کو روانہ ہونے والا تھا .... افریقہ کے بربری ساحل کے ساتھ سفر کرتے ہوئے وہ ۲۶ / مارچ کو اسکندریہ کی بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ اور " صابون سازی کے کارخانوں کے پاس ایک سرائے میں اقامت پذیر ہوئے جو 'ٹھٹھیروں کی سرائے' کہلاتی تھی "

اسکندریہ میں کسٹم والوں کے ہاتھوں ان پر جو بیتی اور جیسا سلوک اُن سے کیا گیا اس کی نظیر آج کل بھی کئی بندرگاہوں میں ملتی ہے۔ کسٹم والے ایک ہزار

سال میں بھی نہیں بدلے۔ ان کی مسافروں سے بداخلاقی اور جبر ستانی نے مہذب مُوری عرب سیاح کا خُون کھولا دیا۔ لیکن ابنِ جُبیر اور دُوسرے زائر تلملانے اور دانت پیسنے کے سوا کیا کر سکتے تھے ؟ اس زمانے کے مسافروں کی طرح وہ بھی کسٹم کے ہاتھ میں بے بس تھے۔ یہ کہانی کچھ ابنِ جُبیر کے قلم سے ہی لُطف دیتی ہے۔ سنیئے!

" مہینے کا پہلا دن اتوار تھا اور اسکندریہ میں ہم ایک دن پہلے داخل ہوئے تھے۔ ہمارے اُترنے کے دن سب سے پہلی چیز جو ہم نے دیکھی یہ تھی کہ سلطان کے کارندے اس سب مال کی جو کہ جہاز میں لدا تھا جانچ پڑتال کرنے کے لیے عرشہ میں آ وارد ہوئے۔ سب مسلمانوں کو ایک ایک کر کے بلایا گیا اور ان کے نام، پتے اور مُلکوں کے نام لکھ لیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک سے پوچھا گیا کہ اس کے پاس کس قدر مال اسباب یا نقدی ہے تاکہ اس سے زکوٰۃ کی وصولی کی جا سکے۔ یہ پُوچھنے کی زحمت نہ کی گئی کہ اس مال کا کتنا حصّہ اس کے قبضے میں پورے ایک سال تک رہا ہے کیونکہ قانونِ شرع کی رو سے زکوٰۃ صرف اس حصّے پر واجب ہوتی ہے۔ تقریباً سب مسافر ایک دینی فرض کی ادائیگی کی غرض سے جا رہے تھے۔ بے چاروں کے پاس بمشکل سفر کے لیے خورش اور کچھ ضروری سامان تھا۔ لیکن ان کارندوں نے ان سے زکوٰۃ وصول کر کے ہی چھوڑی "

مگر ٹھہریئے اتنی جلدی کہاں۔ یہ تو صرف زکوٰۃ وصول کرنے والے تھے۔ کسٹم کا مرحلہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

ابھی باقی ہے :

"مسلمانوں کو پھر حکم دیا گیا کہ اپنی چیزیں اور وہ خورنش اور وہ روپیہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ان کے پاس بچ رہا تھا، وہ ساحل پر لے جائیں - ساحل پر کسٹم کے آدمی اس کُل اسباب کو اُٹھا کر محصول کی چوکی میں لے گئے - چوکی پر پھر مُسلمانوں کو ایک ایک کر کے بلایا گیا - اور ہر ایک کے مال کی اچھی طرح چھان بین کی گئی - چوکی کا کمرہ اس قدر ٹھنسا ہوا تھا کہ سانس لینا دوبھر تھا - مسافروں کی سب چھوٹی بڑی چیزوں کی تلاشی لی گئی اور انھیں گڈمڈ حالت میں اِدھر اُدھر پھینک دیا گیا - مسافروں کے کمربندوں میں ہاتھ ڈالے گئے کہ شاید وہاں کچھ چھپائے ہوئے ہوں - اسباب کے مالکوں سے ایک ایک کر کے اس بات کی قسمیں اُٹھوائی گئیں کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز اور نہیں جو کسٹم والوں کی آنکھ سے بچ گئی ہو - اس چھان بین اور افراتفری میں کتنی ہی چیزیں غائب ہو گئیں - اس ذلت اور لُوٹ کے منظر کے بعد جس کے لیے ہم داعی ہیں کہ خدا ہمیں اس کی جزا دے ، زائرین کو جانے کی اجازت دے دی گئی — اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ان عاملوں میں سے ایک ہے جنھیں بڑے سلطان سے کہ اسے صلاح الدین کہتے ہیں مخفی رکھا جاتا ہے - اگر اس کے کان میں اس کی بھنک پڑ جائے تو جو کچھ اس کے انصاف

اور رحم کے بارے میں سُنا جاتا ہے - اس سے یہ یقین ہے کہ وہ اس ذلت کو ختم کر دے گا . . ."

اسکندریہ کی عمدہ جائے وقوع اور اس کی عمارتوں کی وسعت نے ہمارے سیاح کو بے حد متاثر کیا :

"ہم نے اس سے زیادہ چوڑے کوچوں اور بلند بام عمارتوں کا شہر نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی شہر اسکندریہ جتنا قدیم اور خوبصورت ہے - اس کی منڈیاں بھی شاندار ہیں - شہر کی تعمیر سے متعلق حیرت خیز بات یہ ہے کہ مسطح زمین کے تلے بھی عمارتیں اُوپر کی عمارتوں جیسی ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی وسیع اور محکم ہیں - وہ اس لیے کہ دریائے نیل کے پانی حویلیوں اور کوچوں سے نیچے لہراتے ہوئے بہتے ہیں - کنوئیں آپس میں ملے ہوئے ہیں - ایک کا پانی دوسرے میں بہتا ہے - ہم نے سنگِ مرمر کے بہت سے مرتفع پائے اور مخروطی مینار دیکھے کہ جن کی عظمت اور شان و شوکت پر عقل ورطۂ حیرت میں آ جاتی ہے - آپ بعض کوچوں میں ایسے ستون پائیں گے کہ اُوپر اُٹھتے جاتے ہیں اور آسمان کو چھیدتے ہیں ان کے بنانے کا مقصد کوئی نہیں جانتا - ہمیں بتایا گیا کہ ازمنۂ قدیم میں یہ پائے اور ستون ایک عمارت کو اُٹھائے ہوئے تھے جو فلسفیوں اور حکیموں کے لیے وقف تھی - خدا بہتر جانتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ پائے سیرِ افلاک

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے لیے بنائے گئے تھے "۔

ابنِ جُبیر اور اس کا طبیب ساتھی اسکندریہ کا مشہور روشنی کا مینار بھی دیکھنے کے لیے گئے :

" اس شہر کے نادر عجائبات میں سے ایک یہ مہیب روشنی کا مینار بھی ہے جسے قادرِ مطلق نے ان انسانوں کے ہاتھوں سے تعمیر کروایا ہے ۔ جو اس کڑی مشیّت کے لیے اس لیے معتوب ہوئے کہ خدا کے دوسرے بندے ان کے عذاب سے عبرت حاصل کریں ۔ یہ روشنی کا مینار جہازیوں کے لیے مثل ایک رہبر کے ہے ۔ کیونکہ اس کے بغیر ناخدا اسکندریہ کی صحیح راہ نہیں پا سکتے ۔ یہ مینار سمندر پر ستّر میل دُور سے دکھائی دینے لگتا ہے ۔ اور بڑا قدیم ہے ۔ سب اطراف سے یہ مستحکم ہے اور بلندی میں افلاک کی ہم سری کرتا ہے —— اس کی چوٹی پر ایک مسجد ہے . . . . "

اُنھوں نے اسکندریہ کے مدارس اور اقامت گاہوں کی بھی سیر کی ۔ یہ اقامت گاہیں بیرونی ملکوں کے طالب علموں کے لیے بنائی گئی تھیں ۔ ان میں ہر ایک طالب علم کو رہنے کے لیے جگہ مل سکتی تھی ۔ علم کے ہر شعبے کے آتالیق اور استاد مدارس میں پڑھاتے تھے ۔ طلباء کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کے لیے وظائف ملتے تھے ۔ ان طلباء کے لیے الگ حمام تھے ۔ بیماروں کے علاج کے لیے ایک شفاخانہ تھا جہاں طبیب خاص اسی کام کے لیے مقرر تھے ۔ طلباء کی مدد کے لیے ایسے نائب اور نوکر بھی تھے جو ان کے ہدایت کیے ہوئے طریقِ علاج کے مطابق مریضوں کی خبر گیری کرتے رہتے تھے ——

"اسکندریہ کے لوگ" ابنِ جُبیر لکھتا ہے :

" نہایت آسودہ حالی اور عیش و آرام میں رہتے ہیں ۔ ان سے کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیا جاتا اور سلطان کو ان سے محاصل میں ایک کوڑی کی وصولی بھی نہیں ہوتی ۔ اوقاف کی رقم سب کی سب خیراتی اور علمی کاموں پر لگا دی جاتی ہے ۔ نصرانیوں اور یہودیوں سے جزیہ لیا جاتا ہے مگر بالکل برائے نام اور نہ ہونے کے برابر "۔

ہمارے سیاح کو ایک اور بات جس نے حیران کیا یہ تھی کہ اسکندریہ کے باشندے رات کو بھی اپنے کاروبار میں ایسے ہی سرگرم رہتے تھے ۔ جیسے دن میں —— کم از کم بارہ ہزار مسجدیں شہر میں تھیں اور ہر ایک کے پیش امام کا ماہانہ سلطان سے مقرر تھا ۔

وہ اتوار (اپریل کی تیسری اور ذوالحج کی آٹھ تاریخ) کی صبح کو اسکندریہ سے چلے ۔ بہت سی آباد بستیوں میں سے وہ گزرے ۔ بدھ کے روز پَو پھٹنے کے وقت اُنھوں نے کرائے کی ناؤ میں وَجوَۃ کے مقام پر نیل کی ایک شاخ کو پار کیا ۔ اور مصر کے شہر میں پہنچ گئے ۔

" مصر میں عمرو بن العاص کی مسجد کے قریب چراغوں کے کوچے میں ابوالثنا کی سرائے میں قیام پذیر ہوئے "۔

مصر[1] اور قاہرہ کی عمارات ، اولیاء ، فقہاء اور صحابیوں کے مقابر نے ابنِ جُبیر کے دین دار دل پر بڑا اثر کیا ۔ اور اس کے مرصّع اور فصیح قلم نے ان کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے ۔ وہ نیل پر نئے پُلوں کے پاس اہرامِ مصر کو دیکھنے

---

[1] اس سے ملک مصر مراد نہیں ۔ قاہرہ کے اطراف میں مصر ایک آبادی کا نام تھا ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے لیے بھی گئے ۔ جس طرح آج کل بھی مصر میں جانے والے ٹورسٹ اہرام کو ضرور جاکر دیکھتے ہیں ۔

" ان نئے بُتوں کے پاس یہ قدیم اہرام ہیں کہ ان کی تعمیر کے اعجاز پر عقل دنگ رہ جاتی ہے شکل میں چوطرفے، وہ وسیع چوٹی دار خیموں کی مانند آسماں سے باتیں کرتے ہیں ۔ ان میں سے دو تو خصوصاً اتنے اُونچے ہیں کہ آکاش کے سائبان میں شگاف ڈالتے ہیں ۔ ایک کی لمبائی ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک تین سو چھیاسٹھ قدم ہے ۔ ان کی ساخت میں بڑے بڑے پتھروں سے کام لیا گیا ہے جو ایک دوسرے پر نہایت ہیبتناک طریقے سے جمائے گئے ہیں ۔ اور اس صنعت اور کاریگری سے کہ کوئی مسالہ ان کو جوڑنے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ۔ دیکھنے میں ان کی چوٹیاں مخروطی نظر آتی ہیں ۔ ہوسکتا ہے جاں جوکھوں میں ڈال کر ان کی چڑھائی ممکن ہو ۔ کہتے ہیں ان کی نوکیلی چوٹیاں فراخ اور ہموار ہیں ۔ اگر انسان ان اہرام کو توڑنے یا ڈھانے کی سعی کریں تو یہ سعیٔ لاحاصل ثابت ہوگی ۔ ان کے متعلق مختلف روایات ہیں ۔ بعض کہتے ہیں یہ عاد اور اس کے بیٹوں کے مدفن ہیں ۔ دوسرے کچھ اور بتاتے ہیں ۔ قصّۂ مختصر ماسوائے خدائے ذوالجلال و ذیشان کی ذات کے کوئی ان کا حال نہیں جانتا "......

" ان اہرام کے نزدیک بس ایک تیر کی مار پر پتھر کی ایک

عجیب مورت ہے کہ اس کی شکل ایک نہایت دہشت انگیز انسان کی سی ہے ۔ یہ مورت ایک مینار جتنی بلند ہے ۔ ابوالہول (دہشت کا باپ) اس کا نام ہے ...... اس مورت کا رُخ اہرام کی طرف ہے ، پیٹھ نیل کی جانب[1]"

ابنِ جُبیر بتاتا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہدِ حکومت سے پہلے ملکِ مصر میں بے چارے زائروں کے لیے بے انداز مصیبتیں تھیں ۔ اس حد تک کہ ان سے نیل کے پانی کے استعمال کا بھی ٹیکس بٹورا جاتا تھا ۔ وہ حج پر جانے والے مسافر جو حکومت کو سات مصری دینار کا مقررہ ٹیکس ادا نہ کرسکتے ۔ اُنھیں بحیرۂ قلزم کی بندگاہ عَیذاب پر سخت اذیت ناک سزا دی جاتی اور عیذاب کا مقام ان کے لیے سراپا عذاب ثابت ہوتا ۔

محرّم کی چھٹی اور مئی کی پہلی تاریخ تھی کہ وہ مصر کے شہر سے رُخصت ہوئے اور دریا کے راستے سے ایک بادبانی کشتی میں قوص کے لیے روانہ ہوئے جو بالائی مصر کی ایک دریائی بندرگاہ تھی ۔ دریا کے دونوں کناروں پر کئی قصبے اور بڑے شہر آباد تھے ۔ دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر اسوان کا قصبہ تھا ۔ جہاں مُوسیٰ خُدا سے ہم کلامی کرنے والے پیدا ہوئے اور جہاں سے اُن کی ماں نے اُنھیں نیل کے آبِ رواں پر ایک سرکنڈوں کی ٹوکری میں اُتارا "۔ سفر کے پہلے دو دن تک نیل کے پچھم کی سمت پر یوسف راست باز کا قدیم شہر بھی ان کی نگاہوں کے سامنے رہا ۔ "جہاں وہ زندان ہے جس میں وہ بڑی مدّت تک اسیر رہا" اس زندان کی شکست و ریخت ہو رہی تھی اور اس کے پتھر قاہرہ کی محکم اور ناقابلِ تسخیر حصار کے کام میں لائے

[1] یہاں ابنِ جبیر سے عجیب غلطی ہوگئی ہے ۔ ابوالہول کی پشت اہرام کی طرف ہے اور چہرہ دریائے نیل کی طرف ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

جارہے تھے۔

"اس شہر میں اناج کے وہ گودام بھی ہیں جن میں یوسف راستباز (خدا کی سلامتی ہو اس پر) قحط کے ایام میں مصریوں کے لیے غلّہ اندوختہ کرتا تھا۔"

منیہ اور اسوان کے شہروں میں ٹھہرتے ہوئے جہاں اُنھوں نے مصرِ قدیم کے مہیب ہیکلوں اور معبدوں کو حیرت سے دیکھا وہ قناء میں پہنچے۔ قناء کی حویلیاں شاندار تھیں۔ اور اس شہر میں جو سب سے قابل تعریف بات ابنِ جُبیر کو نظر آئی وہ قناء کی عورتوں کی عفت مآبی اور حیا پروری تھی۔

"جو ہمیشہ اپنے گھر کی چار دیواری میں رہتی ہیں۔ اور کبھی بازاروں میں چلتی پھرتی دکھائی نہیں پڑتیں . . . . قناء نیل کے مشرقی کنارے پر ہے اور اس سے قوص ایک منزل ہے۔"

مُحرّم کی چوبیس اور مئی کی اُنیس تاریخ وہ قوص میں پہنچ گئے۔ اٹھارہ دن وہ نیل کے سینے پر رہے تھے۔ قوص میں عمدہ بازار تھے اور مسافروں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ زائرین اور ہند و یمن اور حبشہ کے سوداگروں کی آمد و رفت کی وجہ سے قوص میں کافی چہل پہل رہتی تھی۔

"یہ ایک ایسا مقام ہے کہ سب یہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ مسافروں کے اُترنے کی منزل۔ اور راہروؤں کی ٹولیوں کے لیے اجتماع کا مقام۔ مغرب، مصر اور اسکندریہ اور آس پاس کے علاقوں کے زائرین یہیں آکر جمع ہوتے ہیں اور حج کر کے اسی مقام کو واپس آتے ہیں۔"

قوص میں ابنِ جُبیر اور اس کے ساتھی شہر کے باہر کے مضافات میں ایک سرائے میں ٹھہرے جس کا نام ابن العجمی کی سرائے تھا۔

چھ جون، صفر کی تیرہ تاریخ کو کہ سوموار کا روز تھا وہ بحیرہ قلزم کی بندرگاہ عیذاب کو روانہ ہوئے۔ پہلے وہ اپنا اسباب اُٹھوا کر شہر کے قریب کھجوروں کے ایک نخلستان میں لے گئے۔ زائرین کا اسباب تُل چکا تو اُسے اُونٹوں پر لاد دیا گیا۔ عشا کی نماز کے بعد وہ اس نخلستان سے چلے۔ اور رات کو ایک چشمے الحاجر پر ان کے قافلے نے پڑاؤ کیا۔ دوسرا دن بھی ان کا الحاجر میں گزرا۔

"کیونکہ بہت سے اونٹوں کے مالکوں کے گھر آس پاس تھے اور وہ سارا دن وہاں غائب رہے۔"

بُدھ کے روز تڑکے قافلہ الحاجر سے چلا۔ دو دن تک وہ ایک لق و دق صحرا میں سفر کرتے رہے کہ جس میں سبزے یا روئیدگی کا نشان نہ تھا۔ جمعہ کی صبح کو وہ ایک پانی کی جگہ العبدین میں اُترے۔

"العبدین کے معنی ہیں، دو غلام۔ اس مقام کا یہ نام یوں پڑا کہ ایک دفعہ دو غلام یہاں پہنچنے سے پہلے ہی پیاس سے مر گئے۔"

انھوں نے دو غلاموں کی قبر پر دعائے فاتحہ کی۔ تین دن کا پانی مشکیزوں میں بھر لیا اور پھر اس خوفناک صحرا کے بیچوں بیچ روانہ ہو گئے۔ سارا دن وہ سفر میں رہتے اور رات کو ڈیرا کرتے۔ عیذاب اور قوص کے قافلے، وقتاً فوقتاً آتے جاتے انھیں ملتے رہتے۔ جس کی وجہ سے انھیں اپنی سلامتی کا احساس رہا اور ڈھارس بندھی رہی کہ وہ محفوظ ہیں۔

سوموار کے روز (اور صفر کے مہینے کے بیسویں دن) وہ ایک پانی کے مقام دنقاش میں آئے۔

"یہاں ایک چشمۂ آب ہے اور اتنے انسان اور حیوان اس چشمے پر پانی پینے آتے ہیں کہ ماسوائے خدائے عزّ و جل کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کوئی ان کا شمار نہیں کر سکتا "

دنقاش میں پانی کے لیے کش مکش میں ایمن کے چند ساربانوں کا کہ جالی کے قبیلے سے تھے کہ ایک مقامی ترکی قبیلے غز کے چند آدمیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ لڑائی میں فریقین کے کئی آدمی زخمی ہوئے۔ لیکن شکر ہے کہ معاملہ ان تک ہی محدود رہا۔

قوص سے عیذاب کو 'دو سڑکیں' جاتی تھیں۔ ایک تو یہی جس پر ابنِ جُبیر کا قافلہ گامزن تھا۔ اور جو دو غلاموں کی سڑک کہلاتی ہے۔ دوسری سڑک اسوان کے راستے سے ہو کر آتی تھی۔ یہ دونوں سڑکیں دنقاش کے چشمے کے قریب آملتی تھیں۔

سوموار کو دن ڈھلے اُنھوں نے ایک دن اور ایک رات کے لیے پانی مشکیزوں میں بھرا اور بُدھ وار کی صبح کو شاغب کے مقام میں پہنچے جہاں کھارے پانی کا ایک چشمہ بہتا تھا۔ تین دن کا پانی یہاں سے لے کر وہ امتان میں اتوار کے روز (کہ صفر کے مہینے کا چھبیسواں دن تھا) پہنچے۔

یہ دن ابنِ جُبیر کے لیے بڑا مبارک تھا کیونکہ اس روز اُس نے خدا کی کتاب پاک قرآن کے حفظ کے کام کی تکمیل کی۔ امتان سے آگے اُنھیں کئی ایک قافلے عیذاب کی طرف سے آتے ہوئے ملے۔ وہ یمن کی راہ سے آتے ہوئے ولایت ہند کا مالِ سوداگری قوص اور مصر کو لے جا رہے تھے۔ یہ مال زیادہ تر لال مرچ، دارچینی اور گرم مصالحہ پر مشتمل تھا۔ مرچیں تو ریت کے ذرّوں کی طرح فراواں تھیں۔ بعض دفعہ اونٹوں کے مالک اونٹوں کی بیماری یا کسی اور وجہ سے اپنے مال کو راستے میں ڈھیریاں بنا کر چھوڑ جاتے۔ وہ مال وہاں اس وقت تک محفوظ پڑا رہتا جب تک کہ اس کے مالک اسے وہاں سے دوبارہ لاد کر نہ لے جاتے۔

ربیع الاوّل کی دوسری تاریخ سنیچر کے روز وہ آخر بحیرۂ قلزم کی بندرگاہ عیذاب میں داخل ہوئے۔

عیذاب

جس کسی نے اس جگہ کا نام عیذاب رکھا تھا اس کی حسِ ظرافت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یہ نام اس پر بالکل راست آتا ہے کیونکہ یہ جگہ جیتا جاگتا جہنم تھی۔ گھاس پھونس کے گنتی کے چھپڑے اور ان میں ملے جُلے چند گارے کے گھر۔ یہ عیذاب کا 'شہر' تھا۔ اس شہر کے گرد کوئی فصیل نہ تھی۔ ہند و یمن کے سوداگروں اور حاجیوں کے جہازوں کی آمد و رفت کی بدولت اس زمانے میں یہ شہر دنیا کی مصروف ترین بندرگاہوں میں سے تھا اور سب قوموں کے جہاز یہاں آتے تھے۔

"عیذاب" ابنِ جُبیر ایک درشت قلم سے لکھتا ہے:

"صحرا میں ہے۔ یہاں کوئی چیز نہیں اُگتی اور خشک زمین ایک بانجھ عورت کی مصداق ہے۔ ماسوائے اس کے جو یہاں باہر سے آتا ہے اس زمین میں کھانے کے لیے کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود عیذاب کے باشندے حاجیوں کے سر پر کافی فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خاص طور سے حج کے دنوں میں ان کی چاندی ہوتی ہے۔ وہ بڑی بے دردی سے حاجیوں کی کھال اُدھیڑتے ہیں۔ اور اس کام میں بڑے ماہر ہیں۔ جو کچھ خورش اور توشہ زائروں کے ساتھ ہوتا ہے یہ لوگ اس کا کچھ حصّہ بطور محصول ان سے بٹور لیتے ہیں۔ زائروں کے آنے سے ایک فائدہ ان کو یہ پہنچتا ہے کہ ان کے جلاب کرائے پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہ یک مستولی جہاز جو زائروں کو جدّہ لے جاتے ہیں اور پھر فرائضِ مقدسہ سے فراغت کے بعد جدّہ سے واپس لاتے ہیں۔ یہاں کے ہر خاندان کے پاس

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہیں - اس موسم میں اہلِ عیذاب بڑے منافع کماتے ہیں اور مُنہ مانگے کرائے لیتے ہیں -- اس شہر میں بمشکل ہی کوئی ایسا خوشحال گھرانہ ہوگا جس کے پاس ایک دو 'جلاب' نہ ہوں - اور وہ ان کے طفیل مزے سے گوران کرتے ہیں - خدا کے لیے سب شان اور فضیلت ہے کہ کُل مخلوقات کو کسی نہ کسی حیلے سے آب و دانہ بہم پہنچاتا ہے اس کے بغیر کوئی اور معبود نہیں "

عیذاب میں وہ ایک حبشی امیر مُونخ نامی کے گھر پر ٹھیرے - یہ شخص کئی پھونس کے جھونپڑوں، متعدد تنبوؤں اور ایک 'جلبہ' کا مالک تھا -

اہلِ عیذاب کا دوسرا پیشہ صدف گیری تھا اور ابنِ جُبیر قدرے تفصیل سے ان طریقوں کا بیان کرتا ہے جس سے غوطہ خور سمندر کے پاتال میں جاکر صدف نکالتے تھے - متمدّن اُندلسی عیذاب کے لوگوں کی حالت پر ترس کھائے بغیر نہیں رہ سکتا -

" وہ ایک ایسے خطّے میں رہتے ہیں کہ جہاں تازہ یا خشک کوئی پیداوار نہیں ہوتی - اور وہ وہاں جنگلی درندوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں - سب شان خداوند باری تعالیٰ کے لیے ہے کہ اُس نے ہر مُلک کے رہنے والوں کے دلوں میں اس ملک کی محبت ڈال دی ہے اور وہ اسے چھوڑ کے نہیں جا سکتے - بے شک یہ لوگ انسانوں کی نسبت حیوانوں سے زیادہ قریب ہیں "

'جلاب' میں عیذاب سے جدّہ کا سفر بڑے خطرات سے پُر تھا - چند خوش نصیب ہی جان سلامت لے کر اس سفر سے لوٹتے تھے - تند قہرستانی ہوائیں اکثر جہازوں کو عیذاب کے دکھن میں دُور ریتلے کناروں پر دھکیل کر لے جاتیں - بعض ناخدا جان بوجھ کر قدرت کے اس عمل میں ممدّ معاون ہوتے کیونکہ کرائے پیشگی وصول کر چکنے کے بعد

وہ زائروں کو جدّہ پہنچانے میں اتنے زیادہ پُرجوش نہیں ہوتے - جب کوئی جہاز ریتلے کنارے پر چڑھ جاتا تو بُجات لوگ جو پہاڑوں میں رہتے تھے اور سوڈانی نسل سے تھے اپنی کھوؤں سے اُتر آتے اور بے بس زائروں کو اپنے اُونٹ کرایہ پر دیتے اور اُنھیں ایک بے آب صحرا میں سے عیذاب کی طرف لے جاتے - بیشتر بے چارے راہ ہی میں سفر کی صعوبت اور پیاس سے مر جاتے - بُجات متوفی کے روپے اور دوسرے سامان پر متصرف ہو جاتے - کئی دفعہ زائر اس بے راہ صحرا میں پیدل بھٹکتے اور راستہ بھُول کر پیاس سے مر جاتے -

" وہ چند جو گھسٹتے، بھٹکتے عیذاب میں پہنچ جاتے ہیں - ان کی حالت ان مُردوں کی سی ہوتی ہے جو اپنی کفنیوں میں جی اُٹھے ہوں - عیذاب کے قیام کے دوران میں ہم نے کئی ایک ایسے مسافر دیکھے - اپنی مجنونانہ، قابلِ رحم کیفیت میں وہ ان لوگوں کے لیے ایک نشان اور عبرت تھے - جو صاحبِ نظر ہیں " زائر جدّہ پہنچنے سے پہلے اسی صحرائی ریتوں پر سفرِ آخرت پر روانہ ہو جاتے -

اور وہ ایک مستول کے جہاز جو ان طوفانی غدار پانیوں میں زائروں کو لے جاتے تھے ان کا حال بھی سنو :

" یہ جلاب کہ اس فرعونی بحیرے کے سینے پر چلتے ہیں ان کے تختے آپس میں چول پر چول بٹھا کر جوڑے جاتے ہیں - ان کی ساخت میں کیل استعمال نہیں ہوتے - ناریل، کھجور کی چھال سے بنے ہوئے رسوں سے ان تختوں کو گتھ اور سی دیتے ہیں - جب جلاب تیار ہو جاتا ہے تو اس پر چربی، ارنڈی کے تیل یا شارک مچھلی کے تیل سے روغن کرتے ہیں - شارک اس سمندر میں ایک مہیب

toobaa-elibrary.blogspot.com

مچھلی ہوتی ہے جو ڈوبنے والے آدمیوں کو ثابت نگل جاتی ہے اور اسی تاک میں جلابوں کے جلو میں ان کا تعاقب کرتی ہے۔ خدا مسلمانوں کو کل آفات سے مامون رکھے۔ جلاب کو اس طرح روغن کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کی سطح چکنی اور پھِسلی ہو جائے تاکہ نوکیلی چٹانیں جو ان پانیوں میں بکثرت ہیں ان کو گزند نہ پہنچا سکیں۔ کیلوں سے بنے ہوئے جہازوں کا یہاں کام نہیں۔ ان جلابوں میں خصوصیت کی بات یہ ہے کہ ان کے بادبان گوند کے درخت کی چھال سے بُنے جاتے ہیں اور ان کی ساخت نہایت کمزور اور بے ڈھنگم سی ہوتی ہے۔ شانِ خداوندی ہے کہ اس نے جلابوں کو اس طریق سے بنانا مقدر کیا ہے اور انسانوں کی جانوں کو ان کے سپرد فرما دیا ہے وہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔"

اس شہرِ جہنّم کے لوگ زائروں سے بڑی سفاکی کا سلوک کرتے تھے۔ وہ جلابوں میں زائروں کو اس طور گھسیڑ دیتے کہ ایک کے اُوپر دوسرا چڑھا ہوا ہوتا اور ٹاپے میں ٹھنسی ہوئی مرغیوں کا سماں نظر آتا۔

"ایسا وہ طمع کی وجہ سے کرتے ہیں تاکہ ایک ہی پھیرے میں زیادہ سے زیادہ کرایہ وصول ہو جائے۔ جلاب کا مالک ایک ہی پھیرے میں جلاب کی پوری لاگت زائروں سے کھسوٹنے کی کوشش کرے گا اور اس کی پروا نہیں کرے گا کہ اس حالت میں سمندر میں جلاب کا کیا حشر بنے گا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا کام جہاز بنانا ہے اور حاجیوں کا اپنی جانیں بچانا۔ یہ ان کی ہر دل عزیز کہاوت ہے۔"

اپنے سارے سفروں میں ابنِ جُبیر کو کبھی کسی جگہ سے اتنی نفرت نہیں ہوئی جتنی عیذاب سے۔ کسی اور مقام پر اس کا غصہ اتنا نہیں بھڑکا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیذاب یقیناً ہر لحاظ سے دوزخ کا نمونہ ہو گا۔

"یہ اسلام کا ایک ایسا خطّہ ہے جو سراسر درّے کی سزا کے لائق ہے"

ابنِ جُبیر چیختا ہے :

"اور اس کے لیے درّہ تلوار ہونی چاہیے۔ جس کے لیے ممکن ہو اس کے لیے سب سے اچھا تو یہ ہے کہ اس شہر پر نگاہ نہ ڈالے۔ اور ادھر آنے کی بجائے شام کے راستے عراق چلا جائے اور وہاں سے امیرِ بغداد کے قافلۂ حج کو جا پکڑے۔ عیذاب کے لوگ بُجات قبیلے کے وحشی سوڈانی ہیں۔ ان کا سلطان بھی ان میں سے ہے اور شہر کے قریب پہاڑوں میں رہتا ہے۔ ان کے مرد اور عورتیں نیم برہنہ باہر پھرتے ہیں اور سوائے ستر ڈھانپنے والے ایک چیتھڑے کے کچھ نہیں پہنتے۔ بعض یہ تکلّف بھی نہیں کرتے۔ قصّہ مختصر یہ لوگ بغیر کسی شرم و حیا کے ہیں اور ان پر لعنت بھیجنا کوئی گناہ نہیں۔"

عیذاب سے جدّہ

سوموار پچیس ربیع الاوّل اٹھارہ جولائی کو وہ جدّہ جانے کے لیے جلبہ میں سوار ہوئے۔ ہوا کے سکوت اور نواتی (ملاحوں) کی غیر حاضری کی وجہ سے ایک دن جلبہ وہاں لنگر کیے رہا۔

"منگل کی صبح کو خدائے عزّ و جل کی عنایت اور اس کی رحمت کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

امّید اپنے سینوں میں لیے ہم بالآخر اس دوزخ سے روانہ ہوئے سوموار کے دن کو چھوڑ کر عیذاب میں ہمارا کل قیام تیئس روز رہا۔

"اور خدا کہ وہ برتر اور قادرِ مطلق ہے ہمیں ان مصائب اور سختیوں کا جو ہم نے وہاں اس کی راہ میں جھیلیں ضرور حشر کے روز اجر دے گا ۔ اس جہنّم میں ہر ایک شے بلکہ پینے کا پانی بھی باہر سے آتا ہے اور پانی بھی کڑوا زہر ہونے کی وجہ سے تشنگی کی حالت سے کم خوش گوار ہے ۔ ہم ایسی ہوا میں رہتے تھے کہ جسم کو پگھلاتی تھی اور ایسا پانی پیتے رہے تھے جو معدے کو خوراک کے خیال ہی سے پھیر دیتا تھا۔ جس نے اس شہر کے متعلق یہ کہا تھا "پانی زہر کا گھونٹ اور ہوا دہکتی آگ" تو اس نے اس کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی ۔ اس شہر میں قیام قدیم اور مقدس گھر (خانہ کعبہ) کے راستے پر زائر کے لیے سب سے بڑا ابتلا ہے لوگ اس کی لعنتوں کی کہانیاں سناتے یہاں تک کہتے ہیں کہ داؤد کے بیٹے سلیمان نے کہ اس پر اور ہمارے نبی کریمؐ پر سلام ہو، عیذاب کو اپنے عفریت کے لیے بطورِ زندان کے منتخب کیا تھا۔ خدا زائروں کو خانۂ مقدس کی سیدھی سڑک پر ڈال کر جو مصر سے عقبۂ عُلیہ کی راہ سے مدینہ منورہ جاتی ہے اس جہنّم سے بچائے ۔۔۔"

ہوا کے ہلکا ہونے کی وجہ سے منگل اور اگلی بدھ وار کو 'جلبہ' زیادہ مسافت طے نہ کر سکا۔ خمیس کی رات کو جب آخری تارے مٹنے لگے تھے اور جہازی ساحلِ حجاز کے پرندوں کو فضا میں زقندیں بھرتے اور چہچہاتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے ۔ پوربی طرف سے بجلی کوندی ۔ ایک بڑا طوفان اُٹھا جس نے آسمانوں پر ردائے سیاہ

اوڑھا دی ۔ طوفان چلتا رہا ۔ اس نے 'جلبہ' کو اپنے اصلی راستے سے ہٹا کر پیچھے دھکیل دیا ۔ پھر چند تارے جھلملانے لگے ۔ اور انھوں نے ان کی راہنمائی کی ۔ اس فرعونی سمندر کی غضب ناکی اور تُندی پُر دہشت تھی ۔ صبح کی آمد سے طوفان کا زور کچھ تھم گیا ۔ ہوا تھم گئی ۔ آسمان صاف اور چمکیلا ہو گیا اور دُور فاصلے پر حجاز کی سرزمینیں اپنے جلوؤں سے ان کی پیاسی نگاہوں کو ترسانے لگیں ۔ اُنھوں نے صرف جدہ کے مشرقی سمت کے پہاڑوں کو دیکھا تھا ۔ اور جہاز کے ربّان (ناخدا) نے انھیں یہ بتا کر ان کی خوشی کم کر دی کہ ان پہاڑوں سے سواحلِ جدہ تک پہنچنے میں دو دن کا سفر ہے ۔

" اس جمعرات کے دن ایک اچھی ، موافق سُبک ہوا ہماری پشت پر رہی ۔ اور دن ڈھلے ہم نے ساحل کے قریب ایک چھوٹے جزیرے پر لنگر ڈالا ۔ ہم نے اپنے سفر کے دوران میں متعدد نوکیلے چٹانی آبی کنارے دیکھے تھے جو پانی کو چھیدتے تھے اور اس کے کھلکھلا کر ہنسنے کا موجب بنتے تھے ۔ ہم بڑی احتیاط سے ان کی پُر پیچ راہوں میں داخل ہوئے ربّان اپنے فن میں طاق تھا اور اس غدّار سمندر کو اپنی ہتھیلی کی طرح جانتا تھا ۔ چنانچہ خدا نے ہمیں ان چٹانی کناروں سے محفوظ رکھا ۔ ۔ ۔ ۔"

اس جزیرے پر وہ جمعے کا سارا دن رہے ۔ کیونکہ ہوا پھر ناموافق چلنے لگی تھی سنیچر کی صبح کو ایک سبک ہوا اُٹھی اور جلبہ ایک پُرسکون سمندر میں سفر کرنے لگا ۔ جو دیکھنے والے کو ایک نیلے بلور کے تھال کا سا منظر پیش کرتا تھا ۔ سارا دن وہ رواں رہے اور خدائے عزّ و جل کی بارگاہ میں شکرانے کی دعائیں پڑھتے رہے ۔ وہ جزیرہ جس پر اُنھوں نے لنگر ڈالا تھا ۔ عائقۃ السفن کے نام سے مشہور تھا جس کا مطلب ہے:

toobaa-elibrary.blogspot.com

جہازوں کے لیے رکاوٹ! وہ اس سے بخیر و خوبی گزر آئے تھے۔ اتوار کی شام کو وہ ابحر کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئے جو جدہ سے ایک دن کی مسافت پر تھا — سوموار علی الصبح وہ اس بندرگاہ کی محفوظ آبنائے میں سے نکلے اور رات پڑنے کے وقت جدہ کے باہر لنگر انداز ہوئے۔ ساری رات اور اگلے دن ہوا تندی سے چلتی رہی اور وہ بندرگاہ میں داخل نہ ہو سکے۔ نوکیلے آبی کناروں کی وجہ سے جدہ میں داخلہ بے حد مشکل اور پُر خطر تھا۔ جلابوں کے ناخدا اور ربّان ان کو جس مہارت اور چابکدستی سے ان کناروں کے بیچوں بیچ میں سے لے جاتے تھے، اس سے ابن جبیر اور اس کے ساتھی حیرت زدہ ہو گئے۔

"وہ (ربّان) تنگ پُر خطر راستے میں داخل ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے 'جلاب' کو اس خوبی سے لے جاتے ہیں۔ جس طرح کوئی شاہسوار ایک ایسے گھوڑے کو سنبھالتا ہے جو سبک لگام اور سدھا ہوا ہو۔"

منگل چار ربیع الآخر چھبیس جولائی کو، بوقت دوپہر وہ جدہ پہنچے۔ عیذاب سے جدہ تک انھیں آٹھ روز سفر میں لگ گئے۔ حالانکہ ہوا موافق رہتی تو یہ سفر دو دن سے زیادہ نہ لیتا۔ اس دوران میں وہ کئی دفعہ جیسے اور مرے۔ اور کئی دفعہ زندگی کی آس کھو بیٹھے۔

جدّہ میں وہ گورنر اعلیٰ کے ہاں ٹھیرے بلکہ ٹھیرائے گئے۔ جدہ کے کنارے پر قدم رکھتے ہی وہ امیر مکّہ کے قیدی تھے۔

جدہ سے مکّہ

ان کی رہائش کھجور کی چھال سے بنے ہوئے ایک بالائی کمرہ میں تھی۔ جدہ میں رواج تھا کہ متمول لوگ اپنے مکانوں کے اوپر ایک اس قسم کا سائبان تعمیر کراتے تھے۔

جہاں وہ رات گزارنے کے لیے جاتے۔

جدہ ایک معمولی ساحلی بستی تھی — عیذاب کی جُڑواں بہن۔ اس کے بیشتر گھر سرکنڈوں کے چھپر تھے لیکن جدہ میں پتھر اور گارے کی بنی ہوئی چند ایک سرائیں بھی تھیں جن کے اُوپر چھال کے بالائی کمرے تھے۔ جن میں آدھی رات کو انسان گرمی کی ہولناکیوں سے آرام کر سکتا تھا۔ جدہ میں قدیم کھنڈرات تھے۔ اور اس کی فصیلوں کے نشان ابھی تک باقی تھے۔

"اس میں پرانے اور بلند گنبد کی عمارت بھی ہے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ کل بشر کی ماں حوّا یہاں رہتی تھی — واللہ اعلم بالصواب۔ شہر میں ایک بابرکت مسجد ہے جسے روایت کے مطابق عمر ابن الخطاب (خدا اس پر اپنی نظرِ عنایت رکھے) نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک مسجد اور بھی ہے جس میں دو آبنوس کی لکڑی کے ستون استادہ ہیں۔ یہ بھی عمر ابن الخطاب (خدا اس پر اپنی نظرِ عنایت رکھے) سے منسوب ہے۔ اگرچہ بعض لوگ اسے ہارون الرشید (خدا اس پر اپنا رحم کرے) سے منسوب کرتے ہیں۔

"اس شہر اور اس کے اطراف کے صحرا کے اکثر باشندے اشراف اور حضرت علی، حضرت حسن، اور حضرت حسین اور حضرت جعفر کے نسب سے ہیں (خدا ان مقدس مورثوں کو اپنی رضا سے نوازے) وہ ایک ایسی فلاکت اور بدحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اسے دیکھ کر سخت ترین پتھر بھی رحم سے پارہ پارہ ہو جائے۔ وہ ہر قسم کے پیشے کرتے ہیں۔ مثلاً اونٹ کرائے پر دینا، دودھ، پانی اور کھجوروں کی طرح کی اشیاء بیچنا۔ وہ لکڑ ہارے بھی ہیں۔ بعض دفعہ ان کی عورتیں بھی اس کام

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہیں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ سب نشان قسام ازل کی ہے جس نے ہر ذی حس کی تقدیر بنا دی ہے۔ بے شک یہ لوگ ایک ایسے نسب کے ہیں جن کے لیے آخرت کی زندگی مقدر ہے۔ اس دُنیا کی زندگی نہیں۔ اللہ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جو آلِ رسولؐ سے محبت رکھنا اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ وہ آلِ رسولؐ جنھیں اُس نے تمام آلائشوں سے پاک صاف کر کے اپنی مخلوق میں ممیّز کیا ہے۔"

"شہر کے باہر ایسی قدیم تعمیرات ہیں جو اس کی بنا (PLANNING) کی قدامت کی شہادت دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے ایک ایرانی شہر تھا۔ اس میں سنگلاخ چٹانوں میں کھدے ہوئے حوض ہیں۔ ایک دوسرے سے منسلک اور تعداد میں اَن گنت۔ یہ حوض شہر کے بیچ میں بھی ہیں اور اس کے باہر بھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ شہر کے باہر ہی صرف تین سو ساٹھ حوض ہیں۔ ہم نے اتنے حوض دیکھے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ بے شک حیرت کی چیزیں اس عالم میں بہت ہیں۔ سب تعریف اور شان اس کے لیے ہے کہ جس کا علم ان سب پر محیط ہے ——

"ان حجازی اور دوسرے خطوں کے بیشتر لوگ فرقہ پرست اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ کے عقاید دینی دوسرے سے نہیں ملتے۔ وہ حقیقتاً لادین ہیں۔ زائرین سے وہ ایسا بُرا سلوک کرتے ہیں کہ ویسا سلوک وہ اپنے ذمیّوں، یہودیوں اور نصرانیوں سے بھی نہیں کرتے۔ وہ زائرین سے ان کے مال و اسباب کا بیشتر حصّہ کسی نہ کسی حیلے سے لُوٹ کھسوٹ لیتے ہیں اور ایسے جواز ڈھونڈھتے

ہیں کہ جن سے اس کے پاس کچھ بھی نہ رہے۔ ان کا بس چلے تو حاجی کی جیب میں ایک حبّہ بھی نہ چھوڑیں اور اس کے جسم کے کپڑے بھی اُتار لیں۔ ان خطوں میں حاجی کو لاتعداد محصولات کی ادائیگی کرنے اور خورد و نوش کا سامان دیتے رہنے سے بالکل فرصت نہیں ملتی۔ اور وہ بڑا خوش نصیب ہے جو ان لوگوں کے لٹیرے ہاتھوں سے اپنی دستار اور جُبّہ ہی بچا کر اپنے وطن کو لوٹ آئے ...... بے شک اگر خداوند باری تعالیٰ ان خطّوں کے مسلمانوں کے معاملات کو صلاح الدین کے ہاتھوں نہ سدھارتا تو یہ لوگ حاجیوں کی تکّا بوٹی کرنے سے نہ چوکتے۔"

صلاح الدین ایوبی نے اپنے فرمان سے جدّہ میں آنے والے سب زائرین پر سے محصول لینے کی ممانعت کر دی تھی اور سال بہ سال امیر مکّہ کو اشرفیوں کے توڑے اور غلّہ اس غرض سے بھجواتا تھا کہ اسے زائروں سے کچھ لینے کی حاجت نہ ہو۔ اس سال اس وظیفے کے آنے میں قدرے دیر ہو گئی تھی۔ نہ غلّہ پہنچا تھا اور نہ ہی اشرفیوں کے توڑے۔ امیر مکّہ نے اسی لیے زائروں کو ڈرانے دھمکانے کا پُرانا آزمایا ہوا منافع انگیز طریقہ دوبارہ اختیار کیا اور اپنے جدہ کے گورنر علی کے توسط سے ان کو یہ دھمکی دی کہ وہ ٹیکس نہیں دیں گے تو ان کو زندان میں پھینک دیا جائے گا۔

گورنر علی ابنِ جُبیر کے صفحات میں محض ایک نام ہے لیکن آدمی سوچتا ہے کہ وہ آج کل کے کئی افسروں کی طرح ایک چکنی چُپڑی باتیں کرنے والا ایک بدمعاش ہو گا۔ غالباً جسیم شحیم کچھ کچھ گنجا، چھپی ہوئی دھمکی، جھوٹی ہمدردی اور چاپلوسی سے پھنسے ہوئے شکار سے روپیہ اگلوانے کے فن میں ماہر۔ ایک مثالی حاکم کی طرح وہ زائروں کو بھی پوری طرح نچوڑتا ہو گا۔ اور اپنے آقا اور خداوند نعمت، امیر مکّہ سے بھی فریب دہی

toobaa-elibrary.blogspot.com

کرتا ہوگا۔ آدمی تعجب کرتا ہے کہ ابنِ جُبیر اور اس کا طبیب ساتھی کسی سرائے میں ٹھہرنے کی بجائے گورنر علی کے مہمان کن حالات میں بنے۔ کیا گورنر علی اپنے سرائے نما مکان کو زائروں کو کرائے پر چڑھا کر سائڈ بزنس کرتا تھا یا یہ کہ اس طرح کے متمول زائروں سے ظاہری دوستی اور ہمدردی جتا کر وہ ان کی جیبوں پر زیادہ آسانی اور صفائی سے ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ ابنِ جُبیر اس کے متعلق ایک لفظ نہیں کہتا۔ جو کچھ بھی ہو، گورنر اپنے آقا امیر مکثر کا بڑا قابل اور کارآمد ملازم ہوگا۔ ورنہ اس کا آقا اس کو اس عہدے پر مامور نہ کرتا۔ جب وہ جدہ پہنچے تو یہی زائروں کو کھسوٹنے کا مسئلہ امیر مکثر اور اس کے گورنر علی کے درمیان زیرِ بحث تھا اور جہاز سے اُترتے ہی اُنھیں حراست میں لے لیا گیا۔ امیر کا حکم پہنچا کہ حاجی ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے ایک دُوسرے کے ضامن ٹھہریں جس کے بعد وہ اللہ کے حرم میں حاضر ہو سکتے ہیں اگر صلاح الدین کے توڑے اور سامانِ خورش اس عرصہ میں پہنچ گیا تو ٹھیک ورنہ (امیر) زائروں سے اپنے محصولات وصول کیے بغیر ان کو نہیں چھوڑے گا۔

"یہ تھا اس امیر کا پیغام۔ جیسے اللہ کا حرم اس کے تصرف میں کوئی موروثی جاگیر تھی۔ اور جیسے اس کو یہ حق پہنچتا تھا کہ چاہے تو زائرین کو اس کی زیارت سے محروم کردے۔ سب پاکیزگی خدا کے لیے ہے۔ جو اس دُنیا کے طریقوں میں تغیر و تبدل کرتا رہتا ہے۔"

سلطان صلاح الدین نے زائروں کے محصولات کے معاوضے میں امیر مکّہ کو جو کچھ دینا ٹھہرایا تھا وہ یہ تھا۔ دو ہزار دینار اور دو ہزار اور دو گیہوں کے پیمانے! اور ان زرعی کرایوں کی رقم جو اُس نے ایک فرمان کے ذریعے بالائی مصر اور یمن میں امیر اور اس کے عمال کے لیے وقف کردی تھی الگ تھی اور اگر وہ منصف مزاج سلطان صلاح الدین اس وقت بلادِ شام میں اہلِ فرنگ کے ساتھ مصروفِ پیکار

نہ ہوتا تو حاجیوں پر امیرِ مکّہ کی یہ جور ستانیاں بھی نہ ہو سکتی تھیں۔ اللہ کے وہ خطّے جنھیں سب سے زیادہ ایک مقدّس جہاد میں تلوار سے پاک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی بدعتیں اور آلائشیں خون کے بہنے سے دُھل جائیں یہی حجاز کے خطّے ہیں۔

متمدن اُندلسی کا خُون بار بار حق پرستانہ غصّے میں کھولتا ہے کہ اللہ کا گھر ایسے لوگوں کی تحویل میں ہو جنھوں نے اسے اپنی معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہو۔ اور زائروں کو اس کے نام پر اس بے دردی سے لوٹتے ہوں کہ ان کے پاس ایک پھُوٹی کوڑی بھی نہ رہنے دیں۔ ......

"اس میں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں کہ اسلام اب رہ گیا ہے تو صرف مغرب کی سرزمینوں میں (مغرب کی سرزمینوں سے مراد شمالی افریقہ اور اُندلس ہیں) وہاں وہ صاف اور سیدھے راستے پر چلتے ہیں جس میں ایسا کوئی افتراق نہیں جیسا کہ ان فرقوں اور زندیقی گروہوں کی ان مشرقی سرزمینوں میں ہے۔ ان میں نہ تو انصاف ہے نہ حق اور نہ ہی دین ..... موحدین اس زمانے کے برحق امام ہیں۔ باقی سب وقت کے بادشاہ دوسرے اور ٹیڑھے راستوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جو مسلمان سوداگروں سے اس طور پر جزیہ وصول کرتے ہیں جیسے ان میں اور ذمیوں میں کچھ فرق نہ ہو۔ ہر ایک حیلے اور بہانے سے ان کے مال و اسباب پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور جبر کے ایسے ایسے طریقے ایجاد و اختراع کرتے ہیں جو — اے میرے اللہ — اب تک کسی نے نہ سُنے تھے۔ یہ سب کے سب سوائے اس منصف

toobaa-elibrary.blogspot.com

مزاج سلطان صلاح الدین کے ؟"

آدمی تعجب کرتا ہے کہ اگر ابنِ جُبیران وقتوں اور ان زمانوں میں رہ رہا ہوتا تو کیا وہ حالات کو کسی طرح مختلف پاتا ۔ سوائے اس کے کہ ریلیں اور بسیں زمین کے سینے پر دندناتی اور بھپٹھاتی ہیں ۔ اور 'جلابوں' کی بجائے مہیب دخانی جہاز سمندروں میں شپ شپاتے ہیں ۔ اور آدمی نے آسمانوں میں اُڑنا سیکھ لیا ہے اور فاصلے کی دُوری اب ختم ہو گئی ہے ۔ انسانی فطرت بالکل ویسی کی ویسی ہے ۔ اب بھی نارتھ ویسٹرن ریلوے کے تھرڈ کلاس ڈبے عیذاب کے جلابوں کی طرح ٹھنسے ہوئے ہوتے ہیں اور مسافر ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا ہوتا ہے ۔ اب بھی ہر ایک شہر میں گورنر علی اور امیر مکثر جیسے سفاک بھیڑیے رہتے ہیں ۔ حکومت کے چھوٹے افسر تحصیلدار تھانیدار جو لوگوں کو بے شرمی سے اور دلیری سے لُوٹتے ہیں ۔ صرف ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے ۔ روپے والے آدمی کے لیے اب بھی زندگی اتنی ہی آسان ہے جتنی اس وقت تھی ۔ لیکن غریب آدمی اب عزّت سے روٹی بھی نہیں کھا سکتا ۔ خارجی حالات بے شک بدل گئے ۔ اصلاحات اور جمہوریت اور ایٹم بم کے نام ہر ایک کے ہونٹوں پر ہیں ۔ اور ہر کوئی اخبار پڑھتا ہے ۔ لیکن اصلیت وہیں کی وہیں ہے ۔ بہت سے ملکوں میں تو ابھی خارجی حالات بھی نہیں بدلے ۔ اور ابنِ جُبیر کی ایک ہزار سال پہلے کی تصویر کا رنگ ابھی بھی تقریباً وہی ہے جو اس کے زمانہ میں تھا .... اور انصاف اور حق اور دین ۔ اب بھی وہ کہاں ہیں؟

منگل گیارہ ربیع الآخر دو اگست کو دن ڈھلے وہ جدہ سے رُخصت ہوئے ۔ جب زائروں نے ایک دوسرے کی ضمانت دے دی اور ان کے نام ایک رجسٹر میں درج کر دیے گئے جسے گورنر علی ابن موفق اپنے آقا کے حکم کے بموجب

ایسے اندراجات کے لیے اپنی تحویل میں رکھتا تھا ، انھیں روانگی کی اجازت دے دی گئی ۔ ساری رات سفر کرتے ہوئے وہ سُورج کے طلوع کے ساتھ ہی القرین میں داخل ہوئے جو زائروں کے لیے پڑاؤ کی منزل تھی ۔ یہاں اُنھوں نے احرام باندھا اور دن بھر ستاتے رہے ۔ شام کے وقت وہ پھر روانہ ہوئے اور پو پھٹنے کے وقت حرم کے نزدیک پہنچے ۔ ایک پہاڑی پر سے اُترے تو دن کا اُجالا پھیلنے لگا تھا اور اللہ کا مقدس حرم ان کی بے تاب عاشق نظروں کے سامنے تھا ۔ کیسے ان کے محبّت بھرے دل دھڑکے ہوں گے ؟ کیا اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین آیا ہوگا ؟ کیا یہ سراب تھا یا حقیقت ؟

مکّۂ معظّمہ

وہ مکّہ میں جمعرات تیرہ ربیع الآخر چار اگست کو ایک پہر دن چڑھے باب عمرہ سے داخل ہوئے ۔ رات کو جب وہ اپنی منزلِ مراد کی راہ پر گامزن تھے تو پورے چاند نے زمین پر اپنی کرنوں سے ضیا پاشی کر دی تھی ۔ رات نے اپنا نقاب اُلٹ دیا تھا اور سب طرفوں سے 'لبیک لبیک' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں ۔" میں آ گیا ہوں ۔ میرے رب میں حاضر ہو گیا ہوں ۔"

"اور وہ شاداں ترین رات زندگی کی سب راتوں کی دولہن ۔ ازل کی سب دوشیزاؤں میں کنواری اور پاکیزہ ۔"

اُنھوں نے خانہ کعبہ کے گرد نئے نئے آنے کا طواف کیا اور مقامِ کریم پر شکرانے کے نوافل ادا کیے ۔ ملتزم کے پاس میں کہ حجرِ اسود اور دروازے کے بیچ میں وہ جگہ ہے جہاں کل دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ کعبہ کے غلاف کے ساتھ چمٹ کر زار و قطار روئے ۔ وہ آبِ زمزم کے گنبد میں داخل ہوئے اور اوک بھر بھر کر اپنی قلبی

toobaa-elibrary.blogspot.com

تشنگی مٹائی اور پھر الصفا اور المروہ کے درمیان سعی کا فرض ادا کیا - اس کے بعد بال منڈوا کر انھوں نے احرام کھول دیے - مکّہ میں وہ ایک گھر میں مقیم ہوئے جس کا نام الحلال تھا اور جو حرم اور اس کے ایک دروازے باب السُدّۃ کے بالکل قریب تھا - اس گھر کے جس کمرے میں وہ ٹھہرے اس میں سب خانگی سہولتیں مہیا تھیں - اور اس کا دریچہ حرم اور مقدس کعبہ کی جانب کھُلتا تھا -

---

قیامِ مکّہ معظمہ

یہاں میری حالت سند باد جہازی کی ہے، جب وہ بغدادی سوداگر ہیروں کی وادی میں کھڑا تھا - حرص و آز کہتی تھی کہ وہ ان سب ہیروں اور موتیوں کو چُن لے جن کے ڈھیروں کے ڈھیر اس کے سامنے تھے - اور ایک بھی نہ چھوڑے - اس کے لیے ناممکن تھا - اور طوعاً و کرہاً اُس نے موتیوں پر ہاتھ مارا اور اُن سے اپنے جُبّے کی جیبیں ٹھونس کر بھر لیں - اور کچھ کو اپنی پیٹی اور عمامے کی تہوں میں چُھپا لیا - لیکن یہ موتی اُن کا بیسواں حصّہ بھی نہ تھے جو وادی میں بکھرے ہوئے تھے -

ابنِ جُبیر کا سفر نامہ موتیوں اور جواہرات کی وسیع وادی ہے اور آدمی ان سب کو اپنے دامن میں جمع کر لینا چاہتا ہے مگر سند باد جہازی کی طرح وہ چند موتیوں کو ہی لے جا سکتا ہے - جبّے اور عمامے کی گنجائش محدود ہے -

مکّہ معظمہ کے ابواب میں مرصّع سحر انگیز نثر میں جو شاعری کے نزدیک ہے مقامات اور واقعات کی حیرت خیز تفصیلات ہیں - ایک متقی اور دین دار مُسلمان ہونے کی وجہ سے اس نے پاک جگہوں کے متعلق ایک نادر تپش اور جوش سے لکھا ہے - ایسے الفاظ میں جو قندیلوں کی طرح فروزاں ہیں اور جن کی تب و تاب پڑھنے والے کے دل کو گرمائے بغیر نہیں رہ سکتی . . . اور خود اندلسی عالم اور شاعر کی متین، متمدن اور عجیب طور سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

دلپذیر شکل ہماری نگاہ کے سامنے سے ایک لحظہ کے لیے نہیں ہٹتی۔ آج کل کے کئی تربیت یافتہ ذہنوں کو شاید وہ شکل کچھ کچھ حیرت انگیز اور مضحکہ خیز لگے۔ لیکن اُنھیں یہ نہ بُھولنا چاہیے کہ وہ اپنے پختہ عقائد اور دینی جوش میں اس وقت اور زمانے کی پیداوار تھا۔ اس میں چھچھورا پن نہیں تھا۔ اور اگرچہ اس کی سنجیدگی بے حد گہری تھی۔ لیکن وہ کوئی پُرتکلف خود پسند، بور یا مغز چاٹ نہ تھا۔ وہ اپنے سفر میں کبھی کبھی اپنے کو مسکرانے کی اجازت بھی دیتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ سڑک پر وہ ایک باغ و بہار ساتھی ہو (گو احمد بن حسین غرناطہ کا طبیب اس کے متعلق بہتر جانتا ہوگا) ابنِ جُبیر اپنے احساسات اور جذبات میں ہم سے مختلف نہیں معلوم دیتا۔ اور اس کی شخصیت ایسی ہے کہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس سے محبّت کرنے لگتے ہیں۔

حرم شریف اور خانہ کعبہ کے ذکر میں سیاح نے بہت سے پُرکشش صفحات لکھے ہیں۔ ان کا لب لباب دینا میرے بس کی بات نہیں۔ نمونے کے طور پر آؤ سنیں کہ وہ حجرِ اسود کا ذکر کس طرح کرتا ہے:

"بابرکت سیاہ پتھّر ایک گوشے میں نصب ہے کہ اس کا رُخ جانبِ شرق ہے۔ نیچے یہ کہاں تک گیا ہوا ہے اس کا کسی کو علم نہیں لیکن روایت ہے کہ یہ دو ہاتھ دیوار کے اندر دھنسا ہوا ہے۔ اس کا عرض دو بازو ہے، لمبائی ایک بازو اور ایک انگشت۔ اس کے چار حصّے ہیں، باہم جُڑے ہُوئے اور کہا جاتا ہے کہ قرمطی (اُس پر خدا کی لعنت برسے) وہ شخص تھا جس نے اس کو توڑا۔ چُومنے پر اس پتھر میں ایک ملائمت اور نمی محسوس ہوتی ہے اور ہونٹ ایسی لذّت سے آشنا ہوتے ہیں کہ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ انھیں وہاں سے کبھی نہ ہٹائے۔ بوسہ دینے والے کے دائیں کو پتھّر کے سالم حصّے پر ایک چھوٹا سفید داغ ہے۔ کہ عجیب طرح چمکتا ہے اور ایک بابرکت سطح پر ایک تل کے مانند ہے۔ اس سفید تل کے متعلق بتاتے ہیں کہ جو اس کو دیکھے گا اس کی بینائی صاف ہو جائے گی، سیاہ پتھّر کو بوسہ دیتے وقت یہ کوشش کرنی چاہیے کہ آدمی کے ہونٹ جہاں تک ممکن ہو اس تل کے قریب ترین مقام پر ثبت ہوں۔"

حرم کے پاس طالب علم، اُستادوں اور عالم آدمیوں کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھتے تھے اور کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹوں میں اپنے سبق یاد کرتے تھے۔

"مسجدِ حرام میں سنگِ مرمر کے پایوں کی تین قطاریں ہیں۔ کعبہ حرم کے وسط میں ہے۔ اور اس کی چار اطراف ٹھیک مشرق۔ جنوب۔ شمال اور مغرب کو ہیں۔ سنگِ مرمر کے پایوں کی تعداد میرے شمار کے مطابق چار سو اکہتر ہوتی ہے۔ میں نے ابوجعفر ابن علی الفنکی القرطبی ماہر قانون اور شارح قرآن کی تصنیفات میں دیکھا ہے۔ کہ ستونوں کی کل تعداد چار سو اسی ہے۔ مگر میں نے وہ ستون شمار نہیں کیے تھے جو بابِ صفا کے باہر ہیں۔ حرم کا صحن بڑا فراخ ہے۔ اور ایک ستون دار برآمدے سے اس میں داخل ہوتے ہیں اس ستون دار برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے تک قوسی محرابوں کے تلے چوکیاں رکھی ہیں جہاں نقل نویس، قرآن خواں اور بعض دوسرے آدمی جو درزی کا کام کرتے ہیں، بیٹھتے ہیں۔"

toobaa-elibrary.blogspot.com

" مقامِ کریم کے پاس خطیب کا منبر ہے جس کے نیچے چار پہیے ہیں۔ جب جمعہ کے دن نماز کا وقت نزدیک آتا ہے تو اس منبر کو کعبہ کی اس طرف لے آیا جاتا ہے جو مقام کے رُخ پر ہے۔ خطیب بابِ رسولؐ میں سے اندر داخل ہوتا ہے جو مقام کے بالمقابل ہے۔ اور اس مستون برآمدے میں ہے جو شرقاً غرباً چلا گیا ہے۔ وہ ایک سنہری گوٹے کے سیاہ جُبے۔ زردوز سیاہ عمامے اور عمدہ کتان کی 'طیلسان' میں ملبوس ہوتا ہے۔ یہ خلیفہ کی پوشاک ہے جسے وہ اپنے ملک کے خطیبوں کو بھجواتا ہے۔ پُرتمکنت چال اور شاہانہ وقار سے آہستہ آہستہ قدم دھرتا ہوا وہ دو سیاہ عَلموں کے بیچ میں چلتا ہے۔ جنھیں اس کے قبیلہ کے موذّن بلند کیے ہوئے ہیں۔ اسی کے لوگوں میں سے ایک سُرخ رنگ کے صیقل شدہ عصا کر ہاتھ میں پکڑے جس کی اُوپر کے سرے سے بٹی ہوئی کھال ایک باریک اور لمبی رسی سے بندھی ہوئی ہے خطیب کے آگے آگے جاتا ہے۔ وہ اس ہنٹر کو اس زور سے چٹختا ہے کہ اس کی بلند پٹاخ خطیب کی آمد کی اطلاع کے طور پر حرم کے اندر اور باہر سنائی پڑتی ہے... وہ اس کوڑے کو مرقعہ کہتے ہیں "

" منبر کے پاس آکر خطیب حجرِ اسود کی طرف گھومتا ہے۔ اسے بوسہ دیتا ہے۔ اور دُعا مانگتا ہے۔ پھر وہ زمزم کے موذّن کے جلو میں ممبر پر چڑھتا ہے۔ زمزم کا موذّن حرم شریف کے سب موذنوں کا سردار ہے اور وہ بھی سیاہ لباس میں ملبوس ہوتا ہے وہ کندھے پر ایک تلوار تھامے ہوتا ہے جسے وہ کمر میں لٹکانے کی بجائے اپنے

ہاتھ میں پکڑتا ہے۔ زمزمی موذّن یہ تلوار خطیب کی کمر میں باندھتا ہے جیسے ہی خطیب منبر کی پہلی سیڑھی چڑھتا ہے وہ تلوار کی میان کی نوک سے سیڑھی پر ایک ضرب لگاتا ہے تاکہ سب سُن لیں۔ وہ میان کو اسی طرح دوسری اور تیسری سیڑھی پر مارتا ہے۔ منبر پہ چڑھ کر وہ دائیں اور بائیں منہ پھیر کر سلام پڑھتا ہے۔ " تم پر سلامتی ہو، اور اللہ کی رحمت اور برکت تم پر ہو " اور حاضرین اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔"

جمادی الاوّل کا نیا چاند نکلا۔ دوسری صبح اُنھیں اپنے نادیدہ دوست۔ اور گورنر علی کے آقا امیر مکثر کو پہلی بار دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ عجیب ہے کہ اس لٹیرے کو دیکھ کر اُندلسی زائر کا غصّہ نہیں بھڑک اُٹھتا کیونکہ بڑی متانت کے انداز میں وہ لکھتا ہے کہ

" امیر حرم شریف میں چڑھتے ہوئے سُورج کی شان سے آیا۔" امیر مکہ کے چاروں طرف اس کے جلودار اور بڑے منصب دار تھے۔ اور آگے آگے قرآن خوان۔ وہ باب الرسول سے اپنے بھالا بردار حبشیوں کے ساتھ حرم میں داخل ہوا۔ حبشی خوفناک طریق سے بھالے گھُماتے اس کے آگے ناچ اور کُود رہے تھے اور سادہ مزاج ابنِ جُبیر اس شان و شوکت سے کافی متاثر ہوا۔ وہ امیر کے متعلق اپنے پہلے احساسات اور جذبات کو بالکل بھُول گیا۔

" اس کا (امیر کا) انداز عاجزانہ، پُرسکون اور پُر وقار تھا۔ اور وہ اپنے شریف مورثوں کی آن کے سیلے تھا۔ سفید پوشاک میں تن زیب چھوٹی مرصع تلوار کمر میں اور سر پر عمدہ سفید اونی ٹوپی۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

امیر مقامِ کریم پر آکر رُک گیا - ایک کتانی جائے نماز اس کے لیے بچھائی گئی - اور اُس نے دو رکعت نماز پڑھی - وہ پھر حجر اسود کی طرف گیا اور اسے بوسہ دیا - پھر اُس نے طواف شروع کیا - ایک نوجوان لڑکا جو زمزم کے موذّن کا بھائی ہے زمزم کے گنبد پر جا چڑھا - اور جب امیرِ مکّہ ایک چکر پورا کر چکا اور حجر کے قریب پہنچ رہا تھا تو اس نوجوان نے کہ نفیس ترین ملبوسات اور پگڑی پہنے تھا گنبد کی بلندی سے اپنی آواز کو دُعا میں اُٹھایا " اے خدا ہمارے آقا امیر مکثر کو یہ طواف مبارک کر اور اسے جاودانی مسرت اور رحمت کاملہ سے نواز " اس کے بعد اُس نے مبارک مہینے کی توصیف میں چند جملے کہے اور مقفّٰے نثر میں دُعائیہ فقروں اور حمد سے بھرپور ایک تقریر کی - امیر کی اور اس کے شریف مورثوں اور رسالت کی برتری کے متعلق چند اشعار پر اُس نے اس تقریر کو ختم کیا - جب امیر رُکن یمانی کے سایہ کے نیچے طواف کے دوران میں پہنچا تو اس نوجوان نے اس قسم کی دُعا پھر پڑھی - اور پھر دوسرے کچھ اشعار گائے جو امیر کی تعریف میں کسی قصیدے کے مقفّے - طواف کے ساتوں چکروں پر نوجوان نے یہی کیا - قرآن خوان طواف کے دوران میں امیر کے آگے آگے رہے - اس نظارے کا نظم اور تجمّل - موذّن کی آواز کا حُسن (اور اس کے باوجود کہ وہ کمسن تھا اور گیارہ سال سے زیادہ اس کی عمر نہ تھی) وہ کلام دلنشیں جو اس نے نثر و نظم میں ادا کیا - خدائے عزّ و جل کی کتاب کو پڑھنے والوں کی خوش لحن صدائیں - یہ سب آنکھوں میں آنسو لے آتی ہیں اور رسولؐ کے اہل و عیال کی یاد تازہ کرتی ہیں کہ جن سے اس نے

سب آلائش دور کر دی ہے - طواف سے فارغ ہو چکنے کے بعد امیر نے ملتزم پر دو رکعتیں نماز ادا کی - پھر دو رکعتیں مقام کے پیچھے پڑھیں اور پھر وہ اپنے خدام کی ہمراہی میں رُخصت ہوا - اس کا طریقہ ہے کہ وہ نئے چاند کے وقت سے پہلے پھر حرم میں نہیں آتا "

آدمی سوچتا ہے کہ کیا اوائل اسلام کے 'سپارٹن ' ایام میں بھی خطیب اس بھڑک سے حرم میں خطبہ پڑھنے آتے تھے - کیا جب وہ جری اور محنت کش خلیفہ عمرؓ کعبہ کا طواف کرتا تھا تو خوش گلو موذّن زمزم کے گنبد پر سے اسی طرح اس کے قصیدے گاتے تھے ؟ کیسے یہ بدعتیں ایک سیدھے صحرائی دین میں رواج پا گئیں - یہ چیزیں بس انسانی فطرت ہی میں رچی ہوئی ہیں - خود اس زمانے کا ایک متمدن اندلسی ایک چھوٹے سے قبائلی سردار امیرِ مکّہ کے اس ملنگانہ ، سستے تجمّل سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں - وہ خوش پوشاک امیر کو اس کے جاہ و حشم کے لیے سب کچھ معاف کر دینے پر تیار معلوم ہوتا ہے —— زائروں پر اس کی جور ستانی - اس کی نخوت اور اس کی طمع سب کچھ -

وہ جبلِ حرا پر بھی گئے " جہاں اللہ کا پاک رسول اکثر عبادت کے لیے جاتا تھا - اور قرآن کی پہلی سورت کا نزول حضورؐ پر اس پہاڑ کی چوٹی پر ہوا تھا " ایک دقیق نظر اور عقیدت سے سرشار سیاح کی طرح ابنِ جُبیر نے مکّہ میں سب مقدّس مقامات کی سیر کی - اور ان کی تعمیری خصوصیات پر مفصل نوٹ قلمبند کیے - مکّہ معظمہ سارے کا سارا ان مقدس اور تاریخی مزاروں اور مقبروں سے بھرا ہوا تھا - خود اس گھر کے پاس جہاں وہ مقیم تھے دو پروں والے جعفر ابن ابو طالب کا گھر تھا اور اس سے چند قدم پر المسفل کی طرف ابوبکر صدیقؓ کی تعمیر شدہ مسجد تھی جس کے گرداگرد کھجور ، انار اور جو جوب کے درختوں کا ایک خوبصورت تاک تھا -

toobaa-elibrary.blogspot.com

"ہم نے وہاں مہندی کے درخت بھی دیکھے۔ مسجد کے سامنے ایک محراب دار چھوٹا سا مکان ہے جس کے متعلق بتاتے ہیں کہ عمر ابن الخطاب اس میں اُن بُت پرستوں سے چھپتے تھے کہ ان کو مارنے کے درپے تھے۔ حضرت خدیجہ کے گھر کے نزدیک اور اسی پہلو کے کوچے میں جس میں اس کا معزز گھر ہے۔ ایک ٹیک والی بینچ رکھی ہے۔ لوگ یہاں دعا مانگتے اور اس کی اطراف کو پونچھنے اور رگڑنے کے لیے آتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ نشست ہے جس پر اللہ کا رسول آکر بیٹھتا اور آرام کرتا تھا۔"

ابو ثور کے پہاڑ میں وہ اس غار کی زیارت کے لیے بھی گئے جہاں رسولؐ اور اس کے دوست ابوبکر صدیقؓ نے کفار سے پناہ ڈھونڈی تھی اور جس کے منہ پر ایک مکڑے نے رسولؐ کی حفاظت کے لیے جالا تان دیا تھا۔

"جب بُت پرست اس جگہ ایک نقش پا شناس رہنما کی مدد سے پہنچے تو وہ شگاف پر ٹھہر گیا اور کہنے لگا "لو اس سے آگے پاؤں کے نشان نہیں جاتے۔ تمھارا دوست یا تو یہاں سے سیدھا آسمان پر چڑھ گیا اور یا زمین اسے کھا گئی۔" اُس نے شگاف پر مکڑے کو اپنا جالا بُنتے دیکھا اور یہ کہہ کر کہ یہاں سے کوئی داخل نہیں ہوا رخصت ہو گئے۔ صدیق نے کہا "اے میرے رسولؐ اگر وہ غار میں دیکھ لیتے تو ہم کیا کرتے"۔ نبی نے جواب دیا "اگر وہ غار میں اس راستے سے ہم تک آ پہنچتے۔ تو ہم وہاں سے باہر نکل جاتے"۔ اور اپنے بابرکت ہاتھ سے انھوں نے غار کی دوسری دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں پہلے کوئی شگاف نہ تھا۔ لیکن خدائے عزوجل کی قدرت سے جونہی رسولؐ نے

ادھر اشارہ کیا۔ دیوار میں ایک شگاف کھل گیا۔ خدا کی شان ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس بابرکت غار کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ خدائے عزوجل کے بنائے ہوئے دروازے کی بجائے اس درز میں سے اندر جائیں، جس میں سے رسول اندر گیا تھا وہ جو اس میں سے اندر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلے تو اوندھے منہ زمین پر لیٹ جاتا ہے اور اپنی گال اس درز سے لگاتا ہے۔ پہلے وہ اپنے سر اور اپنے ہاتھ اندر ڈالتا ہے اور پھر اپنے جسم کو سیکڑ کر درز میں سے گزارتا ہے۔ بعض تو ایسے ہیں جو اپنے بدن کے دُبلے ہونے کی وجہ سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دوسرے آدھے اندر جا کر پھنس جاتے ہیں۔ وہ نہ اندر جا سکتے ہیں اور نہ باہر ہی آ سکتے ہیں۔ اس طرح چٹان کے جبڑوں میں کسے ہوئے، وہ تکلیف اور پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھی اُنھیں پیچھے ٹانگوں سے کھینچ کر زور سے نکالتے ہیں اور ان کے منہ اور جسم بُری طرح چھیلے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے عقل مند آدمی اس شگاف میں سے داخل ہونے سے احتراز کرتے ہیں۔ ان کے احتراز کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے جو خفیف کرنے والی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کی اکثریت کا ایمان ہے کہ جو کوئی اس درز میں نہیں سما سکتا اور اس میں پھنس جاتا ہے۔ حلال کے صلب سے پیدا نہیں ہوا۔ یہ کہانی ان کی زبان پر اتنی چڑھ چکی ہے کہ ان کے لیے سچ ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ شخص جو پھنس جائے اور غار کے اندر نہ جا سکے اُسے نہ صرف اس شرمناک اور رُوح سوز الزام کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

بلکہ اس بدنی تکلیف کے لیے بھی جس میں اُسے موت سامنے نظر آتی ہے
بعض آدمی اسی لیے اس کہاوت کا ذکر کرتے ہیں کہ "ثور (یعنی بیل یا
بیوقوف) کے سوا جبلِ ثور پر کوئی نہیں جاتا ۔"

یہ یقینی ہے کہ ابنِ جُبیر نے اس شگاف میں سے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی اس کے سنجیدہ، قدرے معزز بھاری جسم کے لیے اس میں سے گزرنا ممکن ہوتا ۔ اس کے کہنے پر غرناطہ کے طبیب احمد ابن حسن نے بھی خود کو اس کوشش سے باز رکھا ہوگا۔ کیونکہ وہ بھی غالباً دوہرے بدن کا متمول شہری تھا۔ شگافوں میں سے رینگ کر جانا دو ایسے متین اور سنجیدہ اور خوش خوراک شہریوں کے لیے ویسے بھی کوئی مناسب شغل نہ تھا۔ اور اگر وہ پھنس جاتے تو مکّہ کے سارے چھوٹے بچّے ان کے پیچھے تالیاں بجاتے ۔

"یہ بابرکت شہر" سیاح لکھتا ہے" زمانۂ قدیم سے خدا کے دوست ابراہیم
کی دعاؤں کی برکت سے پھلتا پھولتا رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے خود
فرمایا ہے ۔کیا ہم نے اس شہر کو ایک مقامِ محفوظ پر نہیں بنایا جہاں
ہر نوع کی پیداوار آتی ہے ۔"

اس کا ثبوت مکّہ میں ظاہر ہے ۔ ہر قسم کی پیداوار اس جگہ آتی ہے اور پھل۔ روزمرّہ کی چیزوں اور اجناس میں یہ خطّہ امیر ہے ۔ اس کے بازاروں میں موتی، یاقوت اور فیروزے اور دوسرے بیش قیمت پتھّر بکتے ہیں۔ مختلف قسم کی خوشبوئیں مثلاً مشک آہو، کافور، عنبر اور عود ہندی اور ادویہ اور دوسری اشیاء ہند و حبشہ سے سوداگر یہاں لاتے ہیں۔ عراق و یمن، خراسان اور المغرب، سے جو جو مال مکّہ میں آتا ہے اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ اگر مکّہ کی یہ سب اشیاء دُنیا کے سارے خطّوں میں پھیلا دی جائیں تو ہر خطّے کی تجارتی منڈیوں میں مال بھرا رہے گا اور ہر دن کی گہما گہمی رہے گی ۔ روئے زمین پر کسی جگہ ایسی اشیاء اور مال دستیاب نہیں ہوتا جو زائروں کی آمد پر مکّہ میں دیکھنے میں آتا ہے ۔ یہ ان معجزات میں سے ایک

ہے جو خدا نے خصوصاً اس شہر کے لیے وارد کیے ہیں ۔ ہمارا خیال تھا کہ خورش ۔ پھل اور دوسری اچھی چیزوں میں دُنیا کا کوئی خطّہ اُندلس جیسا خوش قسمت نہ ہوگا۔ اس بابرکت سرزمین میں آکر ہم نے یہاں اچھی چیزوں اور پھلوں کی ایسی افراط دیکھی کہ اندلس کو بھول گئے۔ انجیر، انگور، ناریل، تربوز اور شلغم، گاجر، گوبھی اور دوسری سبزیاں ــــ سب افراط میں ہیں۔ اور یہ پھل دوسرے ملکوں کے پھلوں سے ذائقے میں زیادہ عمدہ ہیں۔ مکّہ میں سب سے لذیذ پھل جو ہم نے کھایا وہ تربوز تھا ۔ اس شہر کے پھل سب خوب ہیں لیکن تربوز میں یہ خاص اور بے مثل خوبی ہے کہ اس کی خوشبو سب خوشبوؤں میں بہترین اور عمدہ ہے ۔ جب کوئی تربوز لیے تمھارے قریب آتا ہے تو پہلے یہ خوشبو تمھارے مشاموں میں پہنچتی ہے اور اس کی مہک اتنی لذّت آفریں ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے تمھارے ذہن سے اس کے کھانے کا خیال محو ہو جاتا ہے، اور جب تم اسے چکھتے ہو تو وہ قند یا خالص ترین شہد کا سا مزہ دیتا ہے ۔ بعض پڑھنے والوں کو شاید اس میں مبالغہ آمیزی نظر آئے لیکن خدا کی قسم جو کچھ میں نے کہا ہے ۔ یہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے ۔ مکّہ کا شہد مسعودی نام کا اُس ماذی شہد سے بھی اچھا ہوتا ہے جس کی شیرینی اور لذّت ضرب المثل ہے اور مختلف قسم کے دُودھ نہایت عمدہ ہوتے ہیں، اور جو مکھن اس دُودھ سے بنتا ہے وہ اپنی صفائی اور شیرینی میں شہد سے پہچانا نہیں جا سکتا ۔ یمن کے لوگ جنھیں السّرو کہتے ہیں ایک قسم کا زیتون لاتے ہیں سیاہ اور سُرخ ۔ اور بادام بھی ــ"

اس کے بعد کس کا جی نہیں چاہے گا کہ وہ مکّہ میں جا کر رہے ؟ لیکن اس زمانے میں مکّہ میں چور بھی تھے جو زائروں کے ہاتھوں سے چیزیں چھین لیتے تھے ۔ ہر ایک کو چوکنا رہنا پڑتا تھا ۔ یہ چور بڑی صفائی اور چالاکی سے مسافر کے ہاتھ یا اس کے کمر بند سے مال اُڑا لیتے تھے ۔

اس سال مکّہ میں گرما کی حدّت میں پچھلے سالوں کی سی تندی نہ تھی ۔ سموم کی شدت

toobaa-elibrary.blogspot.com

بھی کم رہی ۔ زائر اور باشندے اس سال کے حالات کا پہلے سالوں کے حالات سے مقابلہ کرتے نہ تھکتے تھے ۔ وہ یہاں تک کہتے کہ اس سال زمزم کا پانی زیادہ لذیذ ہوگیا ہے ۔ اور پہلے یہ اتنا صاف نہیں تھا ۔

> " اس پانی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اگر اسے اس جگہ پر جہاں سے یہ چشمے میں سے نکلتا ہے چکھا جائے تو بس ذائقہ کو ایسے لگتا ہے جیسے اُونٹنی کے تھنوں سے تازہ اُبلتا ہوا دُودھ ۔ اس بابرکت پانی کی آزمائی ہوئی تاثیر ایک یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کعبے کے گرد زیادہ طواف کرنے سے یا کسی اور وجہ سے سر میں چکر آنے لگے یا اس کے جوڑوں میں ماندگی آجائے تو اس پانی کو جسم پر ڈالتے ہی اسے فوراً راحت اور سکون محسوس ہونے لگے گا ۔ اس میں نئی جان آجائے گی اور اس کا عارضہ رفع ہو جائے گا "

جمادی الآخر شروع ہوا اور پھر امیر مکہ اسی طرح اپنے حبشی بھالہ برداروں اور خدام کی معیت میں کعبہ کے طواف کے لیے حرم میں آیا ۔ جب نئے مہینے کا آغاز ہوتا تو مکہ کے لوگ اس کی خوشی مناتے ۔ وہ ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ۔ گلے ملتے ، ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور اس کے حق میں خدا کی رحمت کے لیے دعائیں مانگتے ۔ یہ اچھی رسم ان کے باہمی محبت اور خلوص کو پھر سے تازہ کرتی ۔

جب کہ اسکندریہ میں آٹھ سو حمام تھے ۔ مکہ میں کل دو حمام تھے ۔ ایک تو محدثِ قرآن المیانشی کے نام پر تھا جو حرم شریف میں لکچر رتھا اور دوسرا بڑا حمام جمال الدین کے نام پر تھا جو " اپنے نام کی مانند دین کا جمال تھا ۔ "

جمال الدین نے جو والیٔ موصل کا وزیر تھا ۔ مکہ اور مدینہ میں کئی خیراتی کام کیے تھے اور دل کھول کر خرچ کیا تھا ۔ اس نے تالاب بنوائے ۔ اُونچی سڑکوں پر کنوئیں کھدوائے جہاں برساتی پانی جمع ہو سکتا ہو ۔ اور حرم شریف کی عمارات جو شکستہ حالت میں تھیں ان کی مرمت کرائی ۔

حرم شریف میں جو چیزیں منع کی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کوئی دولت مند شخص ثواب حاصل کرنے کے لیے اپنے ذاتی روپے سے اس کی کسی عمارت کی بحالی نہیں کر سکتا ۔ اگر اس کی اجازت ہوتی تو متموّل لوگ اس کی دیواریں سونے کی بنا دیتے اور فرش عنبر کے لگوا دیتے ، یہ وہ نہیں کر سکتے ۔ جب دُنیا کا کوئی آدمی کسی عمارت کو بحال کرنا چاہے تو اس کے لیے خلیفہ کی اجازت لینا لازمی ہے ۔ اس عمارت کے کسی کتبے پر اس آدمی یا اس کے روپے کا کچھ ذکر نہ ہوگا ۔ اس کے علاوہ عطیّے Bequest کا بڑا حصہ ، ملک کے امیر کے پاس جانا ضروری تھا ۔ جو اصلی عمارت کی بحالی کے اخراجات سے بھی زیادہ ہوتا تھا یعنی بنانے والے کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے دوہرا خرچ برداشت کرنا پڑتا ۔ لیکن ایک چالاک غیر ملکی دولت مند نے ایک دفعہ وقف کے امیر کو جو چکمہ دیا اس کا دلچسپ حال ابنِ جُبیر سے سنو :

> " موجودہ امیر کے دادا کے زمانہ میں ایک غیر ملکی جو اہلِ دول میں سے تھا ، مقدس حرم میں آیا ۔ زمزم کے چشمے کے منبع کا روزن اور عمارت کا گنبد اُس کی با مذاق آنکھوں کو نہ بھائے ۔ وہ امیر سے ملا اور اُس سے کہا " میں چشمۂ زمزم کے روزن اور اس کے اینٹوں کے خانے کی ایک بہتر شکل میں دوبارہ تعمیر کرانا چاہتا ہوں ۔ میری یہ بھی تمنّا ہے کہ گنبد کو درست کروں اور اپنی دولت کا بیشتر حصہ خرچ کر کے اُن کو حسن کی معراج تک لے آؤں ۔ میری صرف ایک شرط ہے اور میری تمنّا کا حصول تب ہی ممکن ہے کہ تم اسے مان لو اور اس

toobaa-elibrary.blogspot.com

پر کاربند ہو۔" امیر نے پوچھا وہ کیا ؟ غیر ملکی نے جواب دیا" وہ یہ کہ جب تعمیر مکمل ہو جائے اور سب اخراجات اُٹھ چکیں جس کا حساب ایک قابلِ اعتماد محاسب کہ تمھارا مقرر کردہ ہو گا، رکھے گا تو اسی قدر رقم تمھاری نذر کی جائے جتنی کہ تعمیر پر خرچ ہوئی۔" امیر کی حرص سے رال ٹپک پڑی اور وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس تعمیر پر ہزاروں کی لاگت آجائے گی۔ اس نے اپنی رضامندی دے دی اور اس نے اس آدمی کے ساتھ ایک اعتباری محرر لگا دیا جس کے ذمہ یہ کام تھا کہ پائی پائی کا خرچ کھاتے میں درج کرتا رہے۔ اور اس طرح اس آدمی نے اپنا کام شروع کرا دیا۔ اور خدائے عزّوجل کی خوشنودی کے لیے خوب محنت اور جان کاہی سے لگا رہا۔ محرّر اپنے کھاتوں پر ہر بڑے بڑے خرچ کا اندراج کرتا اور امیر ان کی باقاعدہ جانچ پڑتال کرتا اور بغلیں بجاتا کہ جلد ہی وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ سکے گا۔ آخر تعمیر مکمل ہو گئی۔ اور غیر ملکی نے اپنے خواب کی تعبیر پوری کر لی۔ جب غیر ملکی سے حساب کتاب کا کام کرنے کا کام رہ گیا۔ اور امیر طے شدہ رقم کا تقاضا کرنے کے خیال میں ہی تھا۔ وہ آدمی چپ چاپ اس جگہ سے چلا گیا اور ماضی بعید میں داخل ہو گیا۔ (یعنی غائب ہو گیا) وہ ساری رات اس جگہ سے دُور سفر کرتا رہا اور جب صبح ہوئی تو غیر ملکی کو غائب پا کر امیر کفِ افسوس ملتا تھا اور اپنی چھاتیاں پیٹتا تھا۔ لیکن چونکہ عمارت اللہ تعالیٰ کے حرم میں واقع تھی وہ نہ ہی اسے تبدیل کر سکتا تھا اور نہ ہی ڈھا سکتا تھا۔ غیر ملکی نے اس تدبیر سے اللہ کے ہاں اپنا انعام پا لیا۔ خدا تعالیٰ اُس کی خبر گیری کرے اور اسے جنت میں ایک مناسب

مامن عطا فرمائے! حریص امیر کے ساتھ اس غیر ملکی کے چکمے کی کہانی اپنے عجیب اور پُرحیرت ہونے کی وجہ سے زبان زدِ خلائق ہو گئی اور وہ سب جو بابرکت پانی کے گھونٹ بھرتے ہیں اس بے نام شخص پر دعائے خیر پڑھتے ہیں جو طامع امیر کو اتو بنا کر صحرا میں چلا گیا۔"

نئے مہینے رجب کا چاند جمعرات بیس اکتوبر کو طلوع ہوا۔ بہت سے مجاور زائرین اور مکہ کے شریفوں نے اس کی گواہی دی کہ اُنھوں نے چاند کو عمرہ کے راستہ میں دیکھا ہے اور جبل قُعیقان جبل ابی قبیس کی چوٹیوں پر سے بھی۔ اُنھوں نے اس بات کی گواہی امیر اور قاضی کے رُوبرُو دی۔ اب اُسے حرم سے کسی نے نہ دیکھا تھا۔

"مکہّ کے لوگ ماہِ رجب کو زائرین کی ملاقات کا مہینہ اور اپنا سب سے بڑا تہوار سمجھتے ہیں۔ یہ رسم ان کی زمانۂ جاہلیت سے چلی آتی ہے۔ تب وہ اسے مُنصل الاسنّہ (نیزوں سے چھُریاں الگ کرنے والا) کہتے تھے کیونکہ یہ ان پاک مہینوں میں سے ایک تھا جن میں جنگ کرنا حرام سمجھا جاتا تھا اور جنگجو قبائل ہاتھ سے اپنے نیزے اور بھالے رکھ دیتے تھے۔"

"رجب کے عمرہ کا وقت عرفات کی پہاڑی کے جمِ غفیر کے منظر کی یاد دلاتا تھا۔ آس پاس کے لوگ چاروں طرف سے مکہّ پر ایک طرح کا ہلّہ بول دیتے تھے۔" وہ جنھوں نے یہ میلہ نہیں دیکھا ایک ایسے نظارے سے محروم رہ گئے ہیں جسے اس کے عجیب و پُرحیرت ہونے کی وجہ سے مرقوم کرنا ضروری ہے"

اور ابنِ جُبیر اسے پوری تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ میں پڑھنے والے کو اس کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

چند جھلکیاں دوں گا اور ابنِ جُبیر کے اپنے الفاظ میں :

" اس میلے کے لیے کئی دن پہلے سے تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ بدھ وار کی سہ پہر کو کہ جس دن نئے چاند کی توقع تھی، مکّہ کے گلی کوچوں میں اونٹوں پر کَسے ہوئے ہودے ہی ہودے نظر آتے تھے۔ جو زنگارنگ کے ریشم اور عمدہ کتان کے پردوں سے آراستہ تھا۔ سب لوگوں نے بڑھ چڑھ کر اونٹوں کے سجانے میں حصّہ لیا تھا۔ وہ تنعیم کے مقام کی طرف بڑھے جو عمرہ پر جانے والوں کے لیے خیمۂ اجتماع کی جگہ ہے۔ ہودے گویا مکّہ کی وادیوں اور کوہستانی پگڈنڈیوں پر بہتے جاتے تھے۔ شتر سواروں کے نیچے ان کی اُونٹنیاں ہر قسم کے زیورات سے دُلھنوں کی طرح سجی تھیں اور ریشم اور دوسری نظر افروز چیزوں کے طوق اپنی گردنوں میں ڈالے مہار کی مدد کے بغیر اٹھلاتی جاتی تھیں۔ سب سے شاندار ہودہ جو ہم نے دیکھا ' فلیتہ ' کی بیٹی شریفہ جمانہ کا تھا۔ جس کے ہودے کے دامن دُور تک پیچھے زمین پر سرکتے تھے۔ امیر مکّہ اور اس کے منصبداروں کے حرموں کے ہودے بھی کم شاندار نہ تھے۔ اونٹنیوں کی پُشت پر یہ ہودے اُٹھے ہوئے خوشنما خیموں کا سماں باندھتے تھے۔ مکّہ کے لوگوں اور مجاور زائروں میں سے اس دن ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا، جو اس رنگین جلوس کے ہمراہ عمرہ کے لیے نہ گیا ہو۔ ہم بھی اس پاک رات کی برکات حاصل کرنے کے لیے مجنونانہ شوق میں وہاں گئے۔

ہم انسانوں کی بھیڑ اور تنگ راستوں پر ہودوں کے اژدحام کی وجہ سے بڑی دھینگا مشتی کے بعد مسجدِ عائشہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے سڑک کی ساری لمبائی پر دو رویہ جا بجا چمکیلی آگیں روشن تھیں اور مشعل بردار

ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں اُٹھائے مکّہ کی خلوت نشین اور محترم خواتین کے ہودوں کے آگے آگے چلتے تھے۔ جب ہم عمرہ ادا کر چکے، طواف سے فارغ ہو گئے اور الصفا اور المروہ کی درمیانی سعی پر پہنچے، تو رات کا ایک حصّہ گزر چکا تھا۔ اور سارا راستہ آگوں اور لالٹینوں سے روشن تھا اور عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا جو اپنے ہودوں میں عبادت گزاری کر رہے تھے۔ ہم بے حد دقّت سے ہودوں میں ٹھوکریں کھاتے اور اونٹوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے رینگتے گزرے ہم نے اِس دُنیا کی راتوں میں سے سب سے شاندار رات دیکھی۔ یہ اجتماع ہم کو روزِ حساب کے اجتماع کی یاد دلاتا ہے۔ زائرانہ لباس میں ملبوس لوگ لبیک لبیک پکارتے ہوئے اور خدائے عزّ وجل کی بارگاہ میں عاجزانہ التجائیں کرتے ہوئے اور وہ مقدس پہاڑ جو سڑک کو محیط کیے ہوئے تھے ان کی پکاروں اور صداؤں کا بازگشت سے جواب دیتے، یہاں تک کہ کان بہرے ہو گئے اور اس نظارے کی ہیبت پر آنکھیں اشکبار تھیں اور دل شدّتِ جذبات سے آب آب!"

ایسی شیریں بیانی سے کس کا جی بھر سکتا ہے ؟

" اور اس رات حرم شریف عنبریں چمکتے ہوئے لیمپوں سے دن کی طرح جگمگا اُٹھا۔ جب امیر کے سامنے چاند کا دیکھنا ثابت ہو گیا تو اس کے حکم پر جھانجھ اور ڈھول جاگ اُٹھے۔ اور نرسنگھے تہوار کی رات کی نوید دینے لگے۔ دوسری صبح جب امیر ایک بڑے مجمع کے ہمراہ عمرہ کے لیے نکلا تو مکّے کا بچّہ بچّہ اس کے جلوس میں تھا۔ قبیلے اور محلے دار بھی اس کے ساتھ گئے، سوار اور پیدل، بھالوں اور نیزوں

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو دھکاتے ہوئے۔ جو بھی ان کو دیکھتا ان کی گنتی پر حیران ہوتا اور اگر وہ شہر کی بجائے کئی شہروں سے نکل کے آئے ہوتے تب بھی ان کا شمار موجب حیرت ہوتا۔ کجا کہ ایک ہی شہر سے اتنے اَن گنت انسان نکل آئے تھے۔ یہ اس شہر کی برکت کے ثبوتوں کا ثبوت ہے۔"

عمرہ یا چھوٹا حج عرب کے زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا لیکن اب اس کا مقصد اور تھا۔ پہلے یہ عرب کے دیوتاؤں کے لیے ہوتا تھا اور اب صرف ربِّ اوّل و آخر کی خاطر اُندلسی سیاح ایک یمنی قبیلے السرو کا ذکر کرتا ہے جو یمن کے ایک ناقابلِ تسخیر سَرات میں رہتے تھے۔ یہ السّرو تہوار سے دس دن پہلے ہی اپنی پہاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں مکّہ میں اُترنا شروع کر دیتے۔ وہ اپنے ساتھ گیہوں اور غلّہ لاتے اور بہت سی دوسری اجناس۔ مکھن اور شہد اور منقّیٰ اور بادام۔ ان کے آتے ہی بازار کے بھاؤ گر جاتے اجناس کے ڈھیروں کے ڈھیر دکھائی دینے لگتے اور کئی لوگ ایک سال کی خورش ان سے خرید لیتے۔ السّرو میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنی اجناس کی قیمت درہموں یا دیناروں میں قبول نہ کرتے بلکہ ان کا تبادلہ ملبوسات مثلاً عبا اور رشال یا دوسری چیزوں سے۔ مکّہ کے لوگ ان کے لیے یہ چیزیں تیار کر رکھتے۔ مثلاً عورتوں کے نقاب، لحاف وغیرہ۔ السّرو کا ملک زرخیز اور وسیع تھا۔ اس میں انجیروں اور انگوروں کے تاک تھے اور اناج کے لدے ہوئے خوشوں کے لہلہاتے کھلیان وہ خالصتاً عربی تھے اور بڑے فصیح البیان۔ وہ درشت اُور تنومند تھے اور شہری زندگی کے آرام اور تن آسانیوں سے بہت دُور۔ دینی جوش تو اِن میں ضرور تھا لیکن وہ مذہبی ارکان کی بجا آوری سے بیگانۂ محض تھے۔ جب وہ کعبہ میں آتے تو وہ خود کو اس پر اس طرح ڈال دیتے جیسے بچّے ایک محبّت بھری ماں کے سینے سے چمٹ جاتے ہیں۔ وہ اس کے غلافوں سے لپٹ جاتے اور اپنی شدّت اور جوش میں اُنھیں پھاڑ دیتے۔ ان کے قیام کے دوران میں کسی شریف الطبع شہری

کے لیے طواف کرنا حجرِ اسود تک پہنچنا ناممکن ہوتا تھا۔

"جب بابِ کریم کھلتا ہے تو وہ سلام، سلام کہتے داخل ہوتے ہیں، اور اس انداز میں کہ ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں جکڑا ہوتا ہے تیس چالیس آدمی زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی زنجیر کو توڑ دیتا ہے اور بابرکت زینے سے جو حرم کو جاتا ہے گر جاتا ہے۔ وہ جو اس کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں اس صدمے سے اس کے ساتھ گرتے ہیں اور دیکھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔"

(اس سے ظاہر ہے کہ اُندلسی سیاح میں حسِ ظرافت تھی اور اس کا متین عالمانہ چہرہ کبھی کبھی مسکراہٹوں سے شکن آلود ہوتا ہوگا)

"السّرو کا طریقۂ دُعا یا نماز ایسا ہے کہ اہلِ مکّہ کی دل لگی اور لطیفہ بازی کے لیے اس میں وسیع میدان ہے۔ وہ حرم شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور رکعت کے بغیر سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور بڑی تیز تیز نماز پڑھتے ہیں۔ بعض ایک سجدہ دیتے ہیں بعض دو۔ اور بعض تین یا چار۔ پھر زمین سے اپنے سر تھوڑے سے اُوپر اُٹھا کر جس پر ان کی ہتھیلیاں اسی طرح جمی ہوتی ہیں، وہ دائیں اور بائیں منہ پھیرتے ہیں۔ جیسے کسی بات سے خوف زدہ ہوں۔ پھر وہ سلام پڑھتے ہیں یا سلام کے بغیر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کلمہ پڑھے بغیر پھر سیدھے سجدہ میں لیٹ جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنی اس 'نماز' میں ایک دوسرے سے باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کوئی سجدے سے سر اُٹھا کر اپنے

toobaa-elibrary.blogspot.com

ساتھی کو پکارے گا اور اس سے جھگڑا شروع کر دے گا۔"

متمدن مکیوں کے لیے السَروُ کی ان معصوم حرکات میں قدرتاً ہنسی اور تفریح کے بے شمار ممکنات تھے۔ اور ان پہاڑی سادہ لوگوں کے لطیفے گلیوں اور کوچوں میں بڑے لُطف اور مزے سے سنائے جاتے تھے۔ اسی طرح شہری ہر زمانہ میں اپنے دیہات کے سادہ لوح بھائیوں پر ہنستے آئے ہیں۔ ابنِ جُبیر ان کی تعریف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنے بدن پر ایک میلی کچیلی چادر کے ماسوا اور کچھ نہیں پہنتے :

"اس کے باوجود وہ ایک شجاع اور جری قوم ہیں۔ وہ کندھے پر روئی دھنکنے کی کمان جتنی ایک بڑی کمان لٹکا کر پھرتے ہیں جو ان کے سفروں میں اُن سے پل بھر کے لیے جدا نہیں ہوتی۔ اور جب وہ پاک مقامات کی طرف اُترتے ہیں، تو راستے میں بدو لوگ جو مکّی تاجروں اور زائروں کے قافلوں پر دن دہاڑے چھاپہ مارنے سے نہیں ہچکچاتے ان یمنی اجڈ پہاڑی السرو لوگوں کی دلیری سے ڈر جاتے ہیں۔ وہ زائر جو السرو کے ساتھ سفر میں رفاقت کرتے ہیں ان کی خصلت اور عادت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ کیونکہ دینی معاملات میں اپنی حد درجہ معصومیت کے باوجود وہ ایسے لوگ ہیں جو مذہب پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہیں۔ اور اللہ کے نام پر کٹ مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اسی لیے رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ نے ایک دفعہ کہا" ان کو نمازوں کے ظاہری ارکان سکھلاؤ اور یہ تمہیں صدقِ دل سے دعا کرنا سکھلا دیں گے۔"

ایک دفعہ وہ ایک السرو چھوٹے بچّے کی فطرتی ذہانت دیکھ کر حیران ہو گئے۔ گو یہ تعجب کی بات نہ تھی۔ مادرِ فطرت سکول سے بہتر اُستاد ہے اور جو کچھ بچّہ کُھلی جگہوں میں

بھیڑوں کی گلہ بانی سے سیکھ سکتا ہے، وہ اُسے دُنیا کا بہترین مکتب بھی نہیں سکھا سکتا۔ ایک دن اُنھوں نے حجر میں ایک سرو لڑکے کو ایک زائر کے پاس بیٹھے دیکھا جو اُسے قرآن کی پہلی سُورت اور سورۂ اخلاص سکھلا رہا تھا۔ زائر نے یہ الفاظ کہے" قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، (کہو کہ اللہ ایک ہے!) چھوٹے لڑکے نے کہا: "اللہ ایک ہے"۔ زائر نے لڑکے کو اصل آیت ذہن نشین کرانے کے لیے کافی سر مارا اور بڑی مشکل سے لڑکے کے سر میں یہ بات آئی اور اس نے کہا" قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (کہو کہ اللہ ایک ہے) زائر نے پھر پڑھایا "خدائے رحمٰن ورحیم کے نام پر۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ جو رب العالمین ہے"۔ اور لڑکے نے جواب دیا" خدائے رحمٰن ورحیم کے نام پر اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے"۔ اُستاد نے پھر دہرایا اور لڑکے کو بتایا۔ یہ مت کہو اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ صرف یہ کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ پھر لڑکے نے جواب دیا: جب میں نے یہ کہا ہے کہ خدائے رحمٰن ورحیم کے نام پر تو میں دو جملوں میں عطف دینے کی خاطر یہ کہتا ہوں : اور سب حمد اللہ کے لیے ہے، اگر میں نے پہلے یہ نہ کہا ہوتا۔ خدائے رحمٰن ورحیم کے نام پر، اور پچھلے حصے سے شروع کرتا تو پھر یہ کہتا: سب تعریف اللہ کے لیے ہے، تب 'اور' کہنے کی ضرورت نہ ہوتی"۔

وہ اس چھوٹے لڑکے کی ذہانت اور اس کے جملوں کو ملانے اور جدا کرنے کے علم پر بے حد حیران ہوئے اور اس لڑکے نے ابھی مکتب کا مُنہ نہ دیکھا تھا۔

"السَروُ کی فصاحتِ زبان، تعلیم و تدریس کے بغیر حیران کُن ہے اور ان کی دعائیں سُن کر روح عش عش کر اٹھتی ہے اس لڑکے کی حجّت نے پڑھانے والے زائر کو لاجواب کر دیا اور وہ لڑکے کے سامنے احمق لگنے لگا۔"

عمرہ اس رجب کے بے مثل مہینے کے سارے عرصے میں دن رات منایا جاتا تھا

toobaa-elibrary.blogspot.com

لیکن اصل اجتماع مہینے کی پہلی رات کو ہی ہوتا تھا۔

شعبان کے مہینے کا چاند سنیچر کی رات کو نظر آیا کہ انگریزی مہینے نومبر کی اُنیس تاریخ تھی اور حسبِ دستور امیر مکّہ اگلی صبح حرم میں اپنے خدم وحشم کے ساتھ طواف کے لیے آیا۔ لیکن اب اُندلسی سیاح امیر کی طمع کو بالکل بُھلا چکا تھا۔ مہینے کے تیرھویں دن پَو پھٹنے کے بعد چاند کو گرہن لگا۔ گرہن اس وقت شروع ہوا جب لوگ حرم شریف میں نمازِ فجر پڑھ رہے تھے۔ چاند گرہن کی حالت میں غروب ہوگیا۔ چاند کا دو تہائی حصّہ گرہن میں آگیا۔ "خدا ہمیں اپنی کرامات کے ذریعے سبق سکھلاتا ہے۔"

اگلے دن جمعہ کے روز حرم میں ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ مکّہ کا کوئی ایک لڑکا بھی ایسا نہ رہ گیا ہوگا جو صبح ہی حرم میں نہ آپہنچا ہو۔ سب مکّی زمزم کے گنبد میں جمع ہوگئے۔ ایک آواز سے چلاّئے "تحلیل (لاالہ الاالله) اور پھر تکبیر (الله اکبر) پڑھی۔ بعض وقت مجمع میں سے کوئی شخص بھی ان لڑکوں کے ساتھ شامل ہوجاتا اور ان کے ساتھ تحلیل اور تکبیر پکارتا۔ ابنِ جُبیر نے ایک معمر مکّی سے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے کہ لوگ بابرکت گنبد کے گرد اس تعداد میں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پتا چلا کہ بعض جاہلوں کی شہادت پر لوگوں کا خیال ہے کہ ماہِ شعبان کے وسط میں رات کے وقت زمزم کا پانی معمول سے اُونچا اُٹھ آتا ہے۔ اور یہ لوگ اس کرامات کو دیکھنے آئے ہیں۔ چشمے کے روزن پر پانی بانٹنے والا کھڑا کنوئیں سے پانی نکالتا اور اسے ایک ڈول سے لوگوں کے سروں پر ڈالتا جاتا۔ لوگ اور پانی مانگتے اور روتے۔ عورتیں ان کے ساتھ آہ وزاری میں ان کا مقابلہ کرتیں۔ اور اس اثناء میں لڑکے تحلیل وتکبیر کا غلغلہ بلند کرتے۔ یہ ایک روح پرور منظر تھا اور اس کی وجہ سے وہ لوگ جو طواف کرنے آئے تھے طواف نہ کرسکے کیونکہ اس شور اور چیخ وپکار میں عبادت میں توجہ اور شغف کیسے

ممکن ہوتا؟

"ہم میں سے ایک گنبد میں داخل ہوا۔ اور ہجوم کی دھکم دھکا میں اس کی اچھی خاصی دُرگت بنی۔ اُس نے لوگوں کو یہ چلاّتے سُنا "پانی سات ہاتھ چڑھ گیا ہے۔ بارک الله"۔ اس نے خود کو ایک سفید مونچھوں والے شخص کی طرف متوجہ کیا، جس کے چہرے پر دانائی اور ایک گہری فراست نقش تھی۔ اس نے اس سے پوچھا "بڑے میاں۔ کیا پانی سات ہاتھ چڑھ گیا ہے؟" "ہاں"۔ سفید مونچھوں والے نے آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ جواب دیا "پانی سات ہاتھ اُوپر چڑھ آیا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔" ہمارے ساتھی نے پھر اس ظاہراً معقول بوڑھے سے پوچھا۔ "کیا تمھاری اطلاع بالکل درست ہے۔" بوڑھے نے کہا کہ ہاں۔ ایک اور شخص نے جو ایک آنکھ سے کانا تھا بڑے وثوق سے ہمارے ساتھی کو یہ اطلاع دی کہ جب وہ صبح کو آیا تو اس نے دیکھا کہ زمزم کا پانی کنارے سے ایک آدمی کے قد کے برابر اُوپر اُٹھا ہوا ہے۔" اوہ عجیب اور جھوٹی ضعیف الاعتقادی! ہم ایسی ورغلاہٹ سے خدا کے دامن میں پناہ طلب کرتے ہیں۔ مکّہ کے عام لوگوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ زمزم کا پانی شعبان کی وسطی رات کو چڑھ آتا ہے۔ اس کا یقین کرنے کے لیے کہ آیا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے احمد ابن حسین طبیب اور جراح نے اس بابرکت پانی کے کنوئیں میں رسّی سے ڈول نیچے کیا۔ حتیٰ کہ وہ پانی کی سطح کو چھُونے لگا۔ اس نے پھر رسّے کو اس جگہ پر جہاں بینڈھ کا کنارہ تھا، گرہ لگا دی۔ ہم نے گرہ سے لے کر ڈول تک کی لمبائی ناپ لی۔ جس سے ہمیں صحیح طور پر

toobaa-elibrary.blogspot.com

پتا چل گیا کہ پانی مینڈھ سے کتنا نیچا ہے۔ صبح کو لوگ جب پھر دہائی دینے لگے کہ پانی بلاشبہ چڑھ آیا ہے۔ احمد ابن حسین مجمع میں سے راستا بناتا اور ایک ساتھی کے ہمراہ جو ڈول اور رسا اُٹھائے تھا کنوئیں پر پہنچا۔ ڈول کو پانی میں ڈال کر پانی دیکھا تو ماپ وہی تھا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جب سنیچر کی رات کو وہ پھر پانی کو ماپنے کے لیے آیا تو اُس نے اُسے کچھ اُترا ہوا پایا جس کی وجہ یہ تھی کہ سارا دن لوگ اس بابرکت پانی کو نکالتے رہے تھے۔ سنیچر کی صبح کو بھی ہم نے دیکھا کہ پانی مینڈ سے پہلے جتنا نیچا تھا لیکن اگر کوئی اس روز یہ کہہ دیتا کہ پانی نہیں چڑھا تو لوگ اس کفر پر اسے اُٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیتے یا غصّے میں پاؤں کے نیچے روند ڈالتے۔ ہم مجمع کی تندی اور تیزی اور ان کے بھڑک اُٹھنے والے بے قابو جذبات سے خدا کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔

وسط شعبان کی رات مکیوں کے نزدیک بڑی برکتوں اور کرامتوں کی رات تھی۔ اُنھوں نے شام کی نماز کے بعد حرم شریف میں مکہ کے لوگوں اور غیر ملکیوں کا بڑا مجمع دیکھا۔ وہ جماعتوں میں تراویح پڑھتے تھے اور ہر رکعت میں قرآن کی پہلی سورۃ — سورہ الحمد پڑھتے اور اس کے بعد دس دفعہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کا ورد کرتے حتیٰ کہ پچاس تسلیمتیں (یعنی دوگانے) اور سو رکعتیں مکمل ہو جاتیں۔ ہر ایک جماعت کا الگ الگ امام تھا۔ چٹائیاں بچھ گئیں، موم بتیاں روشن کی گئیں اور مشعلیں بھڑکنے لگیں۔" چمکدار چاندنی رات کا فلکی لیمپ زمین پر ضوفگن تھا اور اپنی شعاعیں اور کرنیں حرم شریف سے ملاپ کی خاطر

پھیلاتا تھا۔ جو خود ایک روشنی ہے۔ اوہ! کیا سماں تھا کہ اس حسن کا تخیل اور تصور نہیں بندھ سکتا۔"

اس بابرکت رات کو احمد ابن حسین طبیب نے ایک عجیب واقعہ مشاہدہ کیا۔ ان عجیب واقعات میں سے جو ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتے ہیں۔ جب رات کا تیسرا حصہ ابھی باقی تھا تو طبیب کو نیند کا غلبہ ہوا اور وہ ان بنچوں میں سے ایک پر آرام کرنے چلا گیا، جو حجرِ اسود اور باب الحرم کے سامنے کے حصّے پر زمزم کے گنبد کے گرد بچھے ہوئے تھے۔ وہاں وہ سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ ایک غیر ملکی شخص آیا۔ اور اس کے سرہانے بنچ پر آ بیٹھا اور ایک پُر از سوز اور لوچدار لے میں قرآن پڑھنے لگا۔ بیچ میں وہ آہیں بھرتا اور سسکیاں لیتا۔ وہ اس خوش اَدائی اور گداز سے پڑھتا تھا کہ اس کے الفاظ دل میں اُترتے جاتے تھے۔ احمد ابنِ حسن نے نیند کا خیال ترک کر دیا تاکہ وہ اس غیر ملکی کی قرأت کے حُسن اور جذبے کا لُطف اُٹھا سکے۔ آخر اس شخص نے اپنی قرأت ختم کی اور کہا :

اگر بُرے اعمال مجھے تم سے دُور لے گئے ہیں
تو میرا حُسنِ آرزو مجھے پھر تیرے نزدیک لے آیا ہے

اس نے ان الفاظ کو گا کر بار بار دہرایا اور اس کی آواز میں اتنا سوز تھا کہ پتھر سُنتے تو پگھل جاتے۔ وہ ان سطروں کو بار بار پڑھتا رہا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہتے رہے اور اس کی آواز کپکپانے لگی اور کمزور ہو گئی۔ معاً احمد ابن حسن کو خیال آیا کہ یہ آدمی غش کھانے والا ہے۔ یہ خیال اُسے آیا ہی تھا کہ وہ شخص غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ اور وہاں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ایک ایسی شے کی طرح جسے اُٹھا کر دور پھینک دیا گیا ہو۔ ابن حسن اس ہولناک منظر سے جو اُس نے دیکھا تھا بے حد متوحش ہوا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یقین نہ تھا کہ آدمی زندہ ہے یا مُردہ۔ کیونکہ بنچ فرش سے کافی اُونچا تھا۔ ایک اور شخص بھی جو اس کے پاس سو رہا تھا جاگ اُٹھا اور دونوں اس شخص کو ہلاتے یا اس

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے نزدیک جانے سے خائف، سراسیمگی کی حالت میں کھڑے رہے۔ آخر ایک غیر ملکی عورت یہ چلّاتی ہوئی گزری "کیا اس طرح تم اس شخص کو چھوڑ دو گے۔ اور اس حالت میں" یہ کہتی ہوئی وہ چاہِ زمزم کی طرف تھوڑا سا پانی لینے کے لیے تیزی سے گئی اور لے کر اس آدمی کے منہ پر چھڑکا۔ وہ دونوں پھر اس کے قریب آئے اور اُسے اُٹھا کر بٹھایا لیکن اس آدمی نے انھیں دیکھتے ہی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپالیا — اس ڈر سے کہ کہیں اس کی کیفیت ان کے دلوں پر نہ جم جائے اُٹھا اور بابِ بنوشیبہ کی جانب لڑکھڑاتا ہوا چل پڑا۔ وہ دونوں اس چیز پر جو اُنھوں نے دیکھی تھی حیرت کرتے ہوئے اس آدمی کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ اور ابنِ حسین نے اس شخص کی دعاؤں کی برکات حاصل کرنے کا موقع کھو دینے پر تاسف میں اپنی اُنگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ موقعہ نے یہ اجازت ہی نہ دی کہ وہ آدمی ان سے کچھ کہتا اور ابنِ حسین کے ذہن میں اس آدمی کی شکل کی یاد بھی باقی نہ تھی کہ وہ اُسے دوبارہ تلاش کر لیتا۔ اور اس سے دعاؤں کا خواستگار ہوتا۔

"ان غیر ملکیوں کے اجتماع اپنی رقت خیزی میں، حساسی میں، وجد آوری میں اور عبادت گزاری کی حدت میں فی الواقع حیرت ناک اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ فضل کی دولت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جسے چاہے اسے اس سے مالا مال کر دے۔"

3

حج بیت اللہ

رمضان المبارک کا چاند سوموار اُنیس دسمبر کو دیکھا گیا۔ لیکن مہینے کا پہلا روزہ اتوار کو شروع ہوا۔ کیونکہ بعض لوگوں نے امیر کے روبرو دعویٰ کیا کہ اُنھوں نے چاند دیکھا ہے اس مہینے میں حرم شریف کی رونق خوب بڑھ گئی۔ نئی چٹائیاں بچھائی گئیں اور موم بتیوں، دیوں اور مشعلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ حرم روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ تراویح پڑھانے کے لیے اماموں نے مختلف جماعتیں بنالیں۔ شافعیوں نے جن کو دوسروں پر فضیلت تھی، مسجد کے ایک طرف اپنا امام کھڑا کیا۔ حنبلیوں اور زیدیوں نے اپنے اپنے اماموں کے پیچھے تراویح پڑھیں۔ مالکیوں کے تین قرأت خواں امام تھے جو باری باری پڑھتے تھے۔ اس سال مالکیوں کے فرقے کے افراد معمول سے زیادہ آئے تھے۔ اُن کے پاس دوسری جماعتوں سے زیادہ موم بتیاں تھیں، کیونکہ مالکی سوداگروں کے ایک گروہ نے ایک دوسرے کی ضد میں آکر کعبہ کے امام کو موم بتیوں کی ایک کثیر تعداد پیش کی تھی۔ ان میں دو سب سے بڑی تھیں۔ وزن میں کم و بیش ایک قنطار، ان کو محراب کے سامنے جمایا گیا۔ اور ان کے گرد چھوٹی بڑی بے شمار موم بتیوں کا جھرمٹ تھا۔ مسجد کے مالکی حصے کی خوبصورتی اور بھڑک کو دیکھ کر عقل متحیر ہوتی تھی۔ بعض غیر ملکیوں نے تراویح پڑھنے کی بجائے یہ وقت طواف اور حجر میں عبادت گزاری میں صرف کیا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

ابنِ جُبیر اور اُس کے ساتھی نے اپنے شارحِ قرآن، مرتاض اور خدا ترس دوست قرطبہ کے ابو جعفر بن علی الفنکی کے پیچھے تراویح پڑھیں" جس کی قرأت سخت پتھروں کو پگھلا دیتی ہے۔"

سحری کے اوقات کی خبر دہی زمزم کے موذن کے ذمہ تھی۔ وہ مسجد کے مشرقی گوشے کے مینار پر سے پکارتا کیوں کہ وہ امیر کے گھر سے قریب ترین تھا۔

"وہاں وہ ٹھیک وقت پر کھڑا ہوتا ہے۔ بار بار پکارتا اور تاکید کرتا ہوا کہ اُٹھو سحری کا وقت شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کی مدد کے لیے دو چھوٹے بھائی ہوتے ہیں جو اسے جواب دیتے ہیں اور پھر اپنی باری پر پکار لگاتے ہیں۔ مینار کی چوٹی پر ایک لمبا تختہ ہے جس کے سرے پر پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرح آر پار صلیب بناتا ہوا ایک کھمبا جڑا ہے۔ اس بازو کی دونوں نوکوں پر دو چھوٹی چرخیوں پر دو بڑی شیشے کی لالٹینیں آویزاں ہیں جو سحری کے عرصہ میں روشن رہتی ہیں۔ جب فجر کا اوّلیں سپیدہ نمودار ہونے کے قریب ہوتا ہے اور سحری ختم کرنے کی پکار متعدد بار ہو چکتی ہے تو موذن دونوں لالٹینوں کو تختے پر سے نیچے اُتار لیتا ہے اور نمازِ فجر کی اذان دیتا ہے۔ پھر چاروں اطراف سے دوسرے موذن اذانیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ . . . . مکّہ کے سب گھروں کی چھتیں اُونچی نہیں اور جو کوئی اپنے گھر کی مسجد سے دُوری کی وجہ سے سحری کی پکار سُن سکنے سے قاصر ہو۔ وہ مینار کی چوٹی پر جلتی ہوئی دو لالٹینیں دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ اُنھیں نہیں دیکھے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ سحری کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ اور روزہ شروع

ہو گیا ہے۔"

رمضان کی دوسری تاریخ کو امیر مکثر نے ایک الوداعی طواف کیا اور سلطان صلاح الدین کے بھائی امیر سیف الاسلام طغتکین کے استقبال کے لیے مکّہ سے رُخصت ہوا۔ امیر کی مصر سے روانگی کی خبر پہلے ہی مکّہ میں پہنچ چکی تھی۔ پھر مسلسل اطلاعیں آتی رہیں اور اب تصدیق ہو چکی تھی کہ امیر ینبوع کی بندرگاہ پر اُترنے کے بعد مدینہ کی طرف روضۂ رسول کی زیارت کی خاطر جادہ پیما ہے۔

"مکیّوں کے دلوں میں تشویشناک وسوسے اُٹھے۔ اور خوف نے اُنھیں جکڑ لیا۔ اسی لیے امیر مکثر بظاہر امیر کا استقبال کرنے مگر دراصل اپنی اطاعت کا یقین دلانے کی خاطر اس عجلت میں مدینہ بھاگا۔"

بلادِ مصر و شام و عرب کے خطّے اسلام کے مجاہد سلطان صلاح الدین کی ایمپائر یا دولتِ مشترکہ میں تھے۔ اور گو عرب میں امیرِ مکّہ تقریباً خود مختار تھا۔ وہ سلطان کی دنیائے اسلام کی قیادت اور فرمانروائی کو تسلیم کرتا تھا۔ فیاض اور عادل سلطان نے اپنے ان چھوٹے بادشاہوں اور سرداروں کو کھلی رسی دے رکھی تھی اور اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے احتراز کرتا۔ یہ تو ہم نے بھی دیکھا کہ امیرِ مکّہ سے خراج لینے کا تو کیا مذکور وہ خود اسے خراج بھجواتا تھا تاکہ وہ زائروں اور حاجیوں کو لوٹنے سے باز رہے۔ پھر بھی سلطان کا رعب و دبدبہ ایسا تھا۔ اور اسلامی دنیا میں اس کی سطوت اس درجہ کی تھی کہ اس کے نام پر پُرنخوت امیر اور حکمران کانپنے لگتے تھے۔ سیف الاسلام کی آمد پر امیر مکثر کی دلی کیفیت ایسی ہی ہو گی اور وہ سوچتا ہو گا کہ کہیں اس واقعے کی رپورٹ سلطان کے کانوں تک نہ جا پہنچی ہو۔ بے چارا امیر مکثر! گھر پر اپنی مجبور و بے بس بھیڑوں کے درمیان ایک اتراتا ہوا شیر اور قزاق اور اپنے حکمرانوں کے سامنے ایک جوتیاں رگڑنے والا خوشامدی۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اگلے روز شام کو وہ حجر میں بیٹھے تھے کہ امیر کے ڈھولوں اور مکّہ کی عورتوں کی ٹسکرانے کی آوازیں ان کے کان میں آئیں۔ معلوم ہوا کہ امیر مکثر طغتگین سے مل کر واپس آگیا ہے۔ امیر اتنے میں کعبے میں آپہنچا۔ آتے ہی اُس نے حرم شریف کے گرد سلامتی کا طواف کیا۔ مکیوں نے اس کی واپسی اور صحیح سلامت لوٹ آنے پر مسرّت کے آوازے بلند کیے کیونکہ وہ اس کے متوقع نہ تھے۔ سیف الاسلام بھی مکّہ سے چند میل پر خیمہ زن تھا جب امیر اسے ملا۔ اتنے میں بڑا غلغلہ اور شور اُٹھا اور اُنھوں نے خود امیر سیف الاسلام طغتگین کو اپنے عسکریوں کے ساتھ باب بنی شیبہ میں سے داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے آگے تلواروں کی دمک اور بھڑک اتنی تھی کہ وہ اسے اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ اس کے دائیں کو قاضی تھا اور بائیں کو سردار شیبیتین۔ مسجد میں تماشائیوں اور زائرین کے ہجوم سے ایک زلزلہ سا آگیا۔ اور لوگ اس کے اور اس کے بھائی صلاح الدین کے لیے باآواز بلند دعائیں کرنے لگے۔ زمزم کے موذن نے گنبد پر سے اپنی آواز اس کے لیے دعا اور تعریف میں اُٹھائی لیکن لوگوں کی آواز میں اس کی آواز بالکل ڈوب گئی۔ امیر حرم شریف کے قریب پہنچا تو تلواریں میان میں جاگزیں ہوگئیں۔ عمدہ کپڑے پھینک دیے گئے۔ گردنیں عجز میں جُھک گئیں۔ اور بادشاہوں کے بادشاہ کے گھر کے خوف اور ادب میں امیر اور اُس کے جانباز بے اختیار ہوکر رونے لگے۔ سلجوقیوں کی پلٹن کے آدمی خدا کے قدیم گھر پر اس طرح دیوانہ وار پل پڑے جیسے پروانے شمع پر گرتے ہیں"۔ عجز نے ان کے سر جھکا دیے تھے اور آنسو ان کی مونچھوں کو دھوتے تھے۔"

سیف الاسلام نے طواف ختم کیا۔ مقام کے پیچھے نماز پڑھی۔ زمزم کے گنبد میں جاکر اس کا بابرکت پانی پیا۔ پھر وہ باب الصفا کی طرف سعی کی ادائیگی کے لیے پیدل گیا۔ امیر مکثر کچھ دیر پہلے ہی اپنے گھر کو رخصت ہوچکا تھا۔ غالباً مکیوں پر رعب ڈالنے کے لیے کہ اُسے امیر سیف الاسلام کی زیادہ پروا نہیں۔ حرم شریف کی زیارت کے بعد امیر سیف الاسلام گھوڑے پر سوار اور اپنے سلجوقی شمشیر زنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں سے گھرا ہوا مکّہ کے باہر اپنی خیمہ گاہ کو رخصت ہوا۔

اگلی جمعرات کو سہ پہر کے وقت وہ پھر حجرِ مقدس میں بیٹھے تھے کہ جھانجھنوں، ڈھولوں اور قرناؤں کا شور ان کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ امیر مکثر اپنے منصبداروں کے درمیان دمکتے ہوئے انگارے کی رنگت کا سنہری چغہ پہنے چلا آتا ہے۔ چغے کا پچھلا دامن زمین پر گھسٹتا تھا۔ سر پر کتان عمامہ سحابی رنگت کا، جس میں سونے کی تارکشی تھی اور اتنا پیچدار کہ اس پر بدلیوں کے ہجوم کی مانند تھا۔ چغے کے نیچے ایک نہیں بلکہ دو بھڑکیلی زرتار خلعتی قبائیں۔ امیر مکثر اس لباسِ فاخرہ میں مور کی طرح اتراتا ہوا آیا۔ سیف الاسلام کے حکم سے جس نے یہ پوشاک اور خلعت امیر کو دی تھی۔ امیر کے آنے پر جھانجھنیں اور ڈھول بجائے گئے۔ وہ حرم کے گرد خوش خوش اور مسکراتا ہوا پھرنے لگا۔ اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ امیر سیف الاسلام نے اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کا اسے کھٹکا تھا۔ کہاں تو وہ جان کے لالے اور کہاں یہ عمامہ اور سنہری چغے کی خلعت۔

چودہ رمضان کو امیر سیف الاسلام اپنی ترک پلٹن کے ساتھ یمن کو کوچ کرگیا اور ہمارے اندلسی سیاح کے دوست امیر مکثر کو اس پر جو مسرّت ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ سیف الاسلام کی موجودگی میں قدرتاً اس کی روح دبی دبی رہتی ہوگی۔ اور خلعت کے باوجود دل میں وسوسے اُٹھتے ہوں گے۔

مہینے کے آخری دس راتوں میں ہر طاق تاریخ کو سارا کلام مجید ایک رات میں ختم کیا جاتا۔ اہلِ مکّہ کا رواج تھا کہ نوخیز لڑکے جو حافظ قرآن ہوتے قاضی اور شیوخ کی موجودگی میں قرأت کرتے اور پھر منبر پر چڑھ کر خطبہ بھی دیتے۔

"رمضان کی تیئیسویں ۲۳ رات کو تراویح میں امام ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا تھا کہ جس کی ابھی مسیں نہ بھیگی تھیں۔ اس کے باپ نے جو مکّہ کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اہلِ دول میں تھا۔اس موقعے کی خوشی میں غیر معمولی تیاریاں کی تھیں اور ایک موم کے بنے ہوئے جھاڑ کا انتظام کیا تھا۔جس کی شاخوں اور خانوں پر ہر قسم کے خشک و تر پھل تھے اور بہت سی موم بتیاں بھی ...... محراب کے نزدیک منبر دھرا گیا تھا ـــــــ ایک زنگار رنگ کی چھپائی کیے ہوئے کپڑے سے سجا ہوا۔نوخیز امام آیا۔اس نے تراویح پڑھائیں اور کل قرآن ختم کیا۔اُن بہت سی موم بتیوں کی چکا چوند میں جو اس کے ارد گرد تھیں اس کی صورت بمشکل ہی دیکھی جاتی تھی، وہ پھر محراب سے باہر آیا۔اور اپنی نفیس پوشاک میں غرور سے اٹھلاتا، ایک امام کی آن بان اور جواں سالی کے سکون کے ساتھ۔آنکھوں میں کاجل کے دھارے کھیچے، ہاتھ کلائیوں تک مہندی سے رچے۔لوگوں کے ہجوم میں وہ منبر تک نہ پہنچ سکا۔اور اس کے محافظوں میں سے ایک نے اسے بازوؤں میں اُٹھا کر منبر کے اُوپر پہنچا دیا .... نوعمر واعظ نے ایک فصیح خطبہ پڑھا جس نے بہتوں کو اپنی مترنم روانی سے متاثر کیا۔اس کے سامنے منبر کی سیڑھیوں پر ہاتھ میں شمعدان اُٹھائے ہوئے آدمیوں کا ایک گروہ تھا جو وعظ میں ہر وقفے کے دوران میں یااللہ یااللہ کا ورد بآواز بلند کرتے ـــــــ یہ نوعمر واعظ ذہین اور قابل تھا۔اگرچہ اس کا وعظ دل میں نہ اُتر سکا اور وہ فصیح فقرے جو اس کی زبان بولتی تھی، بس کانوں تک ہی رہ جاتے تھے ـــــــ ہم نے سنا کہ اس اجتماع میں منتخب لوگوں مثلاً قاضی اور چند دوسروں کی پھلوں اور مٹھائیوں سے خوب تواضع کی گئی۔اس واعظ کے باپ نے ان تیاریوں پر جن کا ہم نے ذکر کیا ہے زرِ کثیر صرف کیا ہوگا۔"

عیدالفطر کی نماز عبادت گاہ کی بجائے مسجد میں ہوئی۔پہلے شیبی لوگ آئے جنھوں نے کعبہ کا دروازہ کھولا۔ان کا سردار پائے دہلیز پر بیٹھ گیا اور باقی لوگ اندر چلے گئے۔ جب امیر مکہ اپنے بیٹوں اور اُمرا کے ساتھ آیا تو شیبی اس کا خیر مقدم کرنے باب الرسول تک گئے۔سات طوافوں کے بعد امیر زمزم کے گنبد کے بنچ کی سمت گیا اور اس پر جا بیٹھا۔اس کے لاتعداد بیٹے اس کے دائیں اور بائیں تھے۔اور اس کے وزراء اور عمال اس کے اردگرد تھے۔

نماز کے بعد لوگ مُعلی کے گورستان کو گئے اور مکہ کے بازاروں اور کوچوں میں اس روز بڑے جشن منائے گئے۔شوال کی اُنیس کو وہ مِنیٰ پر پاک رسومات پوری کرنے اور ایک گھر کا معائنہ کرنے کے لیے گئے جو ان کے لیے تشریق میں قیام کے لیے پہلے ہی سے کرایہ پر لے لیا گیا تھا۔

"مِنیٰ کا مقام روح کو انبساط اور سکون سے سرشار کرتا ہے۔یہ بڑے اور وسیع کھنڈرات کا شہر ہے۔لیکن سوائے چند عمارتوں کے یہاں اب شہر کا کچھ نظر نہیں آتا۔ان عمارتوں کے بیچ میں ایک سڑک ہے جو لمبائی اور چوڑائی میں ریس کورس کا منظر پیش کرتی ہے۔"

شوال کی تیرہ کو وہ پھر حرا کے متبرک پہاڑ پر گئے۔اور اس کی چوٹی پر اس غار میں کئی گھنٹے عبادت گزاری کرتے رہے۔جہاں رسول کریمؐ پر پہلا الہام ہوا تھا۔بائیس کو مکہ کے سب لوگ چھوٹے بڑے قاضی کے فرمان پر بارش کے لیے دُعا مانگنے کے لیے کعبہ معظمہ کے سامنے جمع ہو گئے۔قاضی نے دو رکعت نماز پڑھائی اور پھر منبر پر چڑھ کر ایک فصیح خطبے میں نمازیوں کو کہا کہ وہ اپنے بُرے کاموں سے تائب ہوں اور خدا کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

طرف لوٹ جائیں۔ تاکہ اس کا قہر اُن پر نہ ٹوٹے۔

"لوگوں کی آنکھیں رو رو کر آنسوؤں سے خالی ہوگئیں اور ان کی اشک باری میں پانی ختم ہوگیا۔ ان کی چیخیں بلند ہوئیں۔ ان کی آہیں اور سسکیاں سنائی دینے لگیں"۔

پھر قاضی نے اور مجمع نے سنت کے بموجب اپنی ردائیں اپنے اوپر اوڑھ لیں۔ اور لوگ خدا کی رحمت کی امید کرتے ہوئے اپنے کاموں پر چلے گئے۔

تین دن مسلسل مکّہ کے لوگوں نے اسی طریق پر بارش کے لیے دُعا مانگی۔ کیونکہ بارش نہ ہونے سے حجاز کے باشندے سخت مصیبت میں تھے۔ خشک سالی نے اُنھیں بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ اور ان کے گلّوں کو تباہ کر دیا تھا لیکن اہلِ مکّہ کی دُعا قبول نہ ہوئی اور آسمان پر ایک بدلی نمودار نہ ہوئی۔

ایک دن ابنِ جُبیر۔ احمد ابن حسین اور کچھ اور لوگ پھر جبلِ ثور پر اس غار کی زیارت کے لیے گئے جس میں رسولِ اکرمؐ اور ان کے دوست صدیقؓ نے کفارِ مکّہ سے پناہ لی تھی۔ پہلی بار غالباً استہزا یا سبکی کے خوف سے اُنھوں نے تنگ درز میں سے اندر داخل ہونے کی ہمّت نہ کی تھی کہ کہیں ناکامی کی صورت میں اپنی ولدیت سے محروم نہ ہو جائیں۔ اس دفعہ شاید وہ چند مغربی اور غیر ملکی ساتھی اکٹھے ہو کر گئے تھے اور مکّہ کی گلیوں کے شریر لڑکے راہنمائی کے لیے ان کے ساتھ نہ تھے۔ ان کے ساتھیوں میں دو لحیم شحیم مصری بھی تھے۔ اور ان سے بھی ابن جُبیر اور اس کے طبیب دوست کی حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی۔

"ہم اس غار میں اس درز کے راستے داخل ہوئے جس میں سے بعض لوگوں کے لیے گُھسنا مشکل ہے۔ ایک مصری نے بھی اس تنگ راستے سے اندر گُھسنے کی کوشش کی لیکن وہ داخل نہ ہو سکا اور اسے بڑی خفت اور ذلّت کا سامنا کرنا پڑا۔ متعدد بار اس نے کوشش کی اور ناکامیاب ہوا۔ اس کی حالت دیکھ کر لوگ کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کے ترس میں روتے تھے۔ اور اس کے لیے خدائے عزّ وجل کی بارگاہ میں دعائیں مانگتے تھے۔ لیکن اس کا اسے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ایک اور مصری جو اس شخص سے زیادہ فربہ اندام تھا۔ اس کی خدا نے امداد کی اور وہ درز میں سے گزر گیا جو سب کے لیے موجبِ حیرت و تفکّر تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد ہم نے سُنا کہ اس دن اور آدمیوں پر وہی تحقیر آمیز حالت گزری جو پہلے مصری کے ساتھ پیش آئی تھی۔ خدا ہم کو اس زندگی اور آئندہ زندگی میں ان ذلّت خیز حالتوں سے بچائے۔ اس پہاڑ کی چڑھائی بڑی مشکل ہے اور چڑھنے میں دم پھُول جاتا ہے۔ آدمی ہاتھوں کو ٹیکے اور تھکائے بغیر اس پر نہیں چڑھ سکتا۔ یہ مکّہ سے تین میل دُور ہے اور اتنا ہی حرا سے۔ یہ غار اٹھارہ ہاتھ لمبا ہے۔ اور وسط میں اس کی چوڑائی گیارہ ہاتھ ہے اور دونوں سروں پر دو تہائی ہاتھ تنگ شگاف کا راستہ وسط سے ہے۔ دوسرے منہ کی چوڑائی پانچ ہاتھ ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے اس کے دو منہ ہیں"۔

اوہ پیارے لذیذ اُندلسی سیاح! تمھارے متین صفحوں میں کتنی غیر ارادی ظرافت اور مسرّت ہے۔ اور فصیح لڑھکتے ہوئے لمبے فقروں میں کتنی خوبصورتی اور رنگینی! لیکن کاش تم اپنے زمانہ کے دوسرے سیاحوں کی طرح واقعات کو بیان کرنے پر ہی اکتفا نہ کرتے کیونکہ اس ساری واقعہ نگاری میں احمد ابن حسین۔ گورنر علی۔ امیر مکثر اور امیر سیف الاسلام محض نام ہی رہتے ہیں۔ یہ سب ایسے لوگ ہیں جن کو ہم بہتر طور پر جاننے کے خواہشمند

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہیں - کیونکہ ان میں دلچسپی کے ممکنات ہیں - اور تم ہمیں ان کی وقتی شکلیں بھی نہیں دیتے - صرف نام!

اور ذوالقعدہ کے شروع میں سَرْو لوگ اپنی یمنی گھاٹیوں اور کھوؤں پر سے اپنے گیہوں اور غلّے اور منقیٰ اور شہد سے لدے ہوئے اونٹوں کی مہاریں پکڑے مکّہ میں آنے لگے - وہ مکّہ میں صحراؤں اور پہاڑوں کی پروردہ ایک نئی سادگی، مردانگی، رنگینی اور فصاحت لائے - اور جب مکّہ میں اجناس سستی ہو رہی تھیں اور کوچوں میں سَرْو لوگ مکیّوں سے زیادہ تعداد میں پھرنے لگے تھے تو ہمارا باخدا ابنِ جُبیر اُندلسی اسی طرح حرم شریف کے طوافوں اور پاک مقامات کی سیر و زیارت میں سرشار تھا - لیکن چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی اس کی باریک بیں نگاہوں سے نہ بچ سکتی تھی - جو کچھ وہ دیکھتا تھا ماپتا تھا وہ اسے اپنے روزنامچے میں درج کر لیتا تھا - جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا - دن رات کی عبادت گزاری کے باوجود بھی وہ اپنے جرنل لکھنے کا وقت نکال لیتا - وہ ایک باریک بین اور سخت کوش طالب علم اور ایک پیدائشی وقائع نگار تھا - شاید غرناطہ میں گورنر کے سیکرٹری کے عہدے نے اسے جزئیات سے پُر وقائع نگاری کی عادت ڈال دی تھی اور اس کے اسلوب اور طرزِ بیان کو اس طرح منظم اور مسجع بنا دیا تھا - کہ اس کی زمزمہ پردازی ہمیشہ مسلسل اور پُرسحر رہتی ہے -

اُنھوں نے وہ جگہ جا کر دیکھی جہاں رسولِ عالمینؐ پیدا ہوئے -

" یہ ایک حسین و جمیل مسجد ہے اور اس سے پہلے یہاں عبداللہ ابنِ عبدالمطلب رسولؐ کے والد کا گھر تھا - پیدائش کی اصل جگہ فرش میں ایک چھوٹے سے گول برتن کی طرح ہے - تین ہاتھ عرض میں اور اس کے مرکز

میں ایک سبز مرمریں تختی چاندی سے منڈھی ہوئی ہے - ہم نے اس پاک جگہ پر اپنے رخسار رکھے جو دُنیا کے عالی مرتبہ بچّے کی ولادت کی جگہ ہے "

اسی روز وہ حضرت خدیجہ کبریٰ کے مکان میں بھی گئے - اُنھوں نے وہ حجرہ دیکھا جو

" الہامی وجدان کا حجرہ تھا - اور جہاں حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئی تھیں - ولادت کی اصلی جگہ زمین میں ایک گول برتن کی طرح ہے - دیوار سے ملحقہ اسی گھر میں فاطمہؓ کے لال الحسن اور الحسین پیدا ہوئے - ہم نے ولادت کی ان پاک جگہوں پر رُخسار رکھے - اسی مکان میں رسولؐ کا منتہائے (وحی) (اوٹ کی جگہ) بھی ہے جو ایک طرح کا حجرہ ہے - اس میں فرش کے نیچے گہری ایک نشست ہے دیوار سے ایک بڑا پتھر نکلا ہوا ہے اور اس پر ایک چھجّے کی طرح سایہ کرتا ہے - روایت ہے کہ جب رسول کریمؐ وہاں چھپے تھے تو اسی پتھر نے آڑ کا کام دیا تھا"

مہینے کی چوبیس کو ایک دلچسپ بات ہوئی - امیر مکثر کے حکم سے شیبی لوگوں کے سردار محمّد بن اسمٰعیل کی گرفتاری اور اس کے مکان کی تلاشی عمل میں آئی - اسے بعض کوتاہیوں کی بنا پر خانہ کعبہ کی نگرانی اور کہانت سے برطرف کر دیا گیا - امیر مکثر کی نگاہ میں یہ خامیاں خانۂ قدیم کے نگران میں ناقابلِ معافی تھیں - ستائیس کو خانہ کعبہ کا دروازہ ایک اور شخص نے کھولا جو برطرف سردار کا چچیرا بھائی یا کوئی اور قرابتی تھا - امیر مکثر کے خیال میں یہ چچیرا بھائی زیادہ سُلجھی ہوئی عادات کا مالک تھا - ادھر دروازہ کُھلا ادھر سَرْو لوگوں نے جو سَرْووں کی تعداد میں اسی انتظار میں تھے اس پر ہلّہ بول دیا - جس کے نتائج سرو کے لیے اچھے نہ ثابت ہوئے، ان کے کئی آدمی اس ریلے میں روندے گئے اور زخمی ہوئے - وہ ایک ساتھ چڑھے حتیٰ کہ دروازے میں پھنس گئے - اب وہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

نہ آگے بڑھ سکتے تھے نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ آخر بڑی مشکل سے وہ داخل ہوئے اور پھر جلدی سے باہر نکلے۔ باب کریم اتنے بڑے ہجوم کے لیے تنگ تھا۔ کچھ سَرَوْ باہر نکلنے کی کوشش کرتے اور کچھ اندر گھُسنے کی اور اس تصادم میں آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے بعض وقت باہر آنے والے داخل ہونے والوں کے سینے پر چڑھ جاتے پھر پیچھے دھکیلے جاتے۔ اور بعض وقت اندر داخل ہونے والوں کو باہر جانے والے روک لیتے اور پیچھے دھکیلتے۔ جس سے کئی توازن کھو کر گر پڑتے۔ بیشتر سَرَوْ لوگوں کے سروں یا گردنوں پر سے پھلانگتے اندر یا باہر جاتے۔ کعبہ کے نگران شیبی لوگ حرم میں داخل ہونا چاہتے تھے لیکن وہ اس کا موقع نہ پا سکے۔ وہ دروازے کے چوبی حصّوں کے پردوں سے چمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر اُن میں سے ایک کو ایک تدبیر سُوجھی۔ اُس نے پردے کی ایک سَن کی رسّی کو پکڑا۔ اور اس کی مدد سے اتنا اُوپر اُٹھا کہ سَرَوْ لوگوں کے سروں اور گردنوں کو لتاڑتا خانۂ کعبہ میں جا پہنچا۔

جب بھی ابنِ جُبیر ان سادہ صحرائی لوگوں کا ذکر کرتا ہے۔ آدمی کے ہونٹوں پر خواہ مخواہ مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ تاہم یہ نظارہ ہمارے متمدّن شہروں کے سینما گھروں کے سامنے ہر شام دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی روز پاک کعبہ کے غلاف کے پردے ایک آدمی کی قامت کے برابر اُوپر سمیٹ دیے گئے۔

"اس کو احرام کہتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ یہ کعبہ کا احرام ہے۔ کعبہ کا دروازہ اس کے احرام کے وقت سے عرفات پر کھڑے ہونے تک بند رہتا ہے۔ گویا ان پردوں کا چڑھ جانا زائر کو یاد دلاتا ہے کہ ناگزیر الوداع کا اور جدائی کا وقت نزدیک آ پہنچا۔ خدا کرے کہ یہ ہماری آخری الوداع نہ ہو اور اس کی برکت اور شان کے صدقے ہمیں دوبارہ لوٹنا نصیب ہو۔"

جس دن کعبہ نے احرام اختیار کیا۔ اسی روز چوبی گنبد مقدس مقامِ ابراہیم پر سے ہٹا لیا گیا اور اس کی جگہ آہنی گنبد نے لے لی۔ یہ اس لیے کہ امیرِ عراق کے قافلے کے ساتھ آنے والے غیر ملکی اب پہنچا ہی چاہتے تھے۔ وہ یمنی سَرَوْ لوگوں سے بھی زیادہ اکھڑ اور درشت تھے اور خانۂ کعبہ کے لیے ان کی محبّت اتنی تیز تھی کہ اگر گنبد آہنی نہ ہوتا تو وہ اسے کھا لیتے یا اپنے جوش میں اس کے ٹکڑے کر ڈالتے۔

اگلے دن وہ زمزم کے گنبد کے پاس بنچ پر بیٹھے تھے (کیونکہ ابنِ جُبیر کا سارا دن حرم کے آس پاس ہی گزرتا تھا) کہ اُنھوں نے حرم کے برطرف شدہ نگران کو چابیوں کا گچھا ہاتھ میں لٹکائے اور اپنے بیٹوں کو ہمراہ لیے خوش خوش آتے دیکھا۔ وہ بڑے طمطراق سے گردن اکڑائے چل رہا تھا۔ اور وہ چچیرا بھائی جس نے اس کی جگہ لی تھی مُنہ لٹکائے کچھ فاصلے پر پیچھے تھا۔ برطرف سردار نے حرم شریف کا دروازہ کھولا اور وہ اور اس کے بیٹے ایک کھٹولے میں بیٹھ کر رسیوں اور چرخیوں کے ذریعے اُوپر چھت پر جا چڑھے (اصل میں چھت پر گڑی ہوئی آہنی میخوں سے سَن کے مضبوط رسّے نیچے فرش پر لٹکتے تھے جہاں ایک قسم کا لکڑی کا کھٹولا ان سے بندھا رہتا تھا۔ اس میں شیبی یعنی خانہ کعبہ کے نگران بیٹھ جاتے تھے اور آہنی چرخیوں کی مدد سے اُوپر کھینچے جاتے تھے تاکہ ہوا یا آندھی سے پردے اگر پھٹ جائیں تو ان کی مرمت کریں) دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ امیر نے پھر اس معزول شدہ افسر کو اپنے پہلے عہدے پر بحال کر دیا ہے۔ احمد ابن حسین نے ایک معزز مکّی سے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا۔ سردار کے خلاف الزامات تو سب کے سب سچ تھے۔ مکّی نے اپنی داڑھی میں خلال کرتے ہوئے آنکھ ماری اور مسکرایا۔

" تم غیر ملکی ان باتوں کو کیا جانو۔ ہم تو روز دیکھتے ہیں کہ شیبی سردار آج معطل ہوتا ہے اور کل پھر موجود ہے۔ بھائیو۔ اس عہدے پر بحالی کے لیے اس سے پانچ سَے مکّی دینار مانگے گئے تھے۔ اسں

toobaa-elibrary.blogspot.com

نے یہ رقم اپنے ایک تاجر قرابتی سے اُدھار لی اور ادا کر دی...

تم کیا سمجھتے ہو "

وہ اس مَلّی کی بات پر حیران ہوئے اور دیر تک سوچتے رہے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ سردار کی حراست اس بنا پر نہ تھی کہ اس کے ہاتھوں خدا کی پاک جگھوں کی بے حُرمتی ہوئی تھی بلکہ اس لیے کہ امیر اس سے روپیہ اینٹھنا چاہتا تھا۔ خدا کے اپنے گھر میں رشوت ستانی اور حرص کو اس طرح کارفرما دیکھ کر غرناطہ کے دونوں سیاحوں کو بڑا دُکھ پہنچا۔

ذوالحج — ۹

جمعرات کی رات کو کہ انگریزی مہینے مارچ کی پندرہ تاریخ تھی ذوالحج کا چاند نکلا۔ بعض لوگوں کی افترا پردازی اور جھوٹی شہادت نے ہمارے سیّاح کے خون کو پھر کھولا دیا اور وہ لوگ تو سنگسار ہوتے بچے۔

بات یہ ہوئی کہ سب لوگ جمعرات کی رات کو آسمانوں میں نئے چاند کو تلاش کر رہے تھے۔ اُفق پر ہوا کہر آلود ہو گئی تھی۔ اور بدلیاں اکٹھی ہو گئی تھی۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ لالی کی ایک مدھم لکیر ظاہر ہوئی۔ لوگ حسرت کر رہے تھے کہ بدلیاں کچھ چھٹیں تو وہ نئے چاند کا دیدار کریں۔ اتنے میں ان میں سے ایک چلّایا " اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" اس پر سب لوگ چلّائے " اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" وہ اُٹھ اُٹھ کر اس کو دیکھتے اور اوپر اشارے کر کے ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے۔ اس اشتیاق میں کہ عرفات کا وقفہ اور قیام جمعے کے روز ہو اور یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ان کے چاند دیکھ لینے پر منحصر ہے۔ اُنھوں نے جھوٹی شہادتیں بنالیں۔ مغربیوں کی ٹولی چند مصریوں کے ساتھ قاضی کے پاس گئی اور وہاں ان سب نے وثوق سے کہا، اُنھوں نے چاند دیکھا ہے۔ قاضی نے اُنھیں بڑی سختی سے

جھڑکا۔ ان کی شہادت کو مسترد کر دیا۔ اور ان کے بیانات کو بیہودہ قرار دیتے ہوئے اس نے یہ کہہ کر اُنھیں بالکل خفیف کر دیا۔

" یا حیرت! اگر تم میں سے کوئی یہ آکر دعویٰ کرتا کہ اس نے ایسی گہری بدلیوں میں سے سُورج کو دیکھ لیا ہے تو بھی میں یقین نہ کرتا۔ پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ تم نے ایک نیا چاند دیکھ لیا ہے جو صرف اُنتیس راتوں کے بعد طلوع ہوا ہے "

دوسری باتوں کے بیچ میں اس نے یہ بھی کہا :

" مغربیوں کے حواس ٹھکانے نہیں ہوتے۔ آنکھ کی بھوؤں کا ایک بال بھی اُنھیں نظر پڑ جائے تو اپنے تخیل کی آنکھ میں اسے نیا چاند بنا لیتے ہیں "

قاضی نے اس جھُوٹی شہادت کے معاملہ میں سختی اور عقل سے کام لیا اور سب سمجھدار لوگوں نے اس کے اقدام کو سراہا۔

" اور ان کو یہ کرنا بھی چاہیے تھا کیونکہ حج کے مناسک مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت کے ہیں۔ کہ وہ ہر دور دراز رستے سے آکر اس مقصد کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اگر ان کے معاملے میں نرمی برتی جائے تو عقاید کو ضرر پہنچے گا اور دین میں بدعت اور غلط خیالی راہ پائے گی۔ خدا اپنی رحمت سے سب مہملات اور ان کی خرابیوں کو اسلام سے خارج کرے!"

اب حج نزدیک آیا تو ہر روز عازمین حج کے قافلے مکّہ میں آنے لگے۔ یمنی سَرو اور دُنیا کے ہر ملک کے لوگ مکّہ کی گلیوں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ بابرکت مہینے کے آغاز سے ہی امیر مکّہ کے ڈھول صبح و شام اور ہر نماز کے اوقات میں پیٹے جاتے تھے،

toobaa-elibrary.blogspot.com

تاکہ ہر ایک کے ذہن میں رہے کہ یہ حج کا متبرک مہینہ ہے۔عرفات پر چڑھائی کے دن تک یہی دستور رہا۔

مہینے کی چوتھی یا پانچویں تھی کہ عدن کا گورنر امیر عثمان ابن علی مکہ میں آپہنچا۔اس کے آنے کا سبب امیر سیف الاسلام اور اس کے سلجوقی سوار تھے جو یمن کی سمت بڑھ رہے تھے۔امیر عثمان ابن علی سلجوقیوں کے عدن میں پہنچنے سے پہلے حج کی آڑ لے کر بھاگ آیا تھا۔اس صوبے کی گورنری کے طویل عرصے میں ہز اکسی لینسی نے خوب ہاتھ رنگے تھے اور سوداگروں اور دوسرے لوگوں سے دونوں ہاتھوں سے روپیہ سمیٹا تھا۔سلجوقی شاہزادے کی پوچھ گچھ سے ڈر کر اس نے ایک تمام اپنے خزانے جواہرات اور قیمتی ساز و سامان کو بحری بیڑے کے جلابوں میں لدوا دیا۔اور اپنے حرم اور معتمدوں کے ساتھ عدن سے سوار ہوگیا۔امیر سیف الاسلام کے جنگی جہازوں (حراریق) نے اس کے جہازوں کا تعاقب کیا اور اس کی لوٹ کا بیشتر سامان پکڑا گیا۔کچھ ہلکی قیمتی چیزیں وہ اپنے ساتھ ساحل پر لانے میں کامیاب ہوگیا۔اور اپنی بیویوں اور غلاموں کی معیت میں سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلے میں مکہ پہنچا۔لوگوں کی نظروں کے سامنے روپے کی پیٹیاں اور قیمتی ساز و سامان ایک گھر میں لے جایا گیا۔جسے اُس نے پہلے مکہ میں اپنی رہائش کے لیے تعمیر کرایا تھا۔

"ہند سے آئے ہوئے خزانے سب اس کے ہاتھ میں آتے تھے اور اس نے کثیر ناجائز منافع کمائے اور قارون کی دولت جمع کرلی۔ لیکن زمانے کی گردش نے اب اُسے بدحال کرنا شروع کردیا تھا اور اسے یہ معلوم نہیں کہ صلاح الدین کا سلوک اس سے کیسا ہوگا۔یہ دُنیا ان سب کو جو اس سے ہر چیز سے زیادہ محبت کرتے ہیں مٹا دیتی ہے۔ خدا کا انعام بہترین خزانہ ہے۔اور اس کی اطاعت سب سے اچھا

مالِ غنیمت۔خدا واحد ہے"

یہ عجیب ہے کہ امیر مکثر نے اس بھگوڑے گورنر کو مکہ میں پناہ دے دی۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس نے گورنر کو اپنے حال پر رہنے دینے کی اچھی خاصی قیمت موتیوں اور تحائف کی شکل میں اس سے اینٹھی ہو۔ابنِ جُبیر اس بارے میں کچھ نہیں کہتا۔

مہینے کی آٹھویں تاریخ کو لوگوں نے جوق در جوق مِنیٰ کی پہاڑی پر چڑھائی کی۔ اور وہاں سے عرفات کو بڑھ چلے قاعدہ کے مطابق تو اُنھیں رات وہاں بسر کرنی چاہیے تھی لیکن بدو قبیلہ بنو شیبہ کے خوف سے جو عرفات کی راہ پر زائروں پر حملے کرتے تھے۔انھوں نے عرفات میں شب بسری کا خیال چھوڑ دیا۔عدن کا گورنر بنو شیبہ کے سدِ باب کے لیے اپنے عسکریوں کے ہمراہ مزدلفہ اور عرفات کی گہری گھاٹی پر گیا۔وہاں اس نے اپنے فوجیوں کی چھاؤنی سی قائم کرلی۔اور خود گھوڑے کی پیٹھ پر سوار پہاڑ کے اُوپر قراولی کی غرض سے جا چڑھا۔گورنر کی دلیری اور خاص طور پر اس کے گھوڑے کی ہمت نے اُندلسی سیّاح کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اب یہ کہتا ہے

"امیر عثمان نے یہ مبارک جہاد کر کے دو ثواب کمائے — ایک حج کا اور دوسرا حاجیوں کی حفاظت کرنے کا"

لیکن جہاد کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔خیالی بنو شعبہ نے اپنا منہ تک نہ دکھایا۔ اور امیر عثمان گورنر جدہ نے مفت میں زائروں کی نگاہ میں وقار اور عزّت حاصل کرلی جس کا وہ قطعاً حق دار نہ تھا۔

"عرفات ایک وسیع میدان ہے۔اور اگر یہ قیامت کے روز تمام خلقتِ انسانی کے اجتماع کی جگہ بھی ہو تو بھی سب اسی میں سما جائیں۔اس وسیع میدان کے گرد بہت سے کوہسار گھیرا کیے ہوئے ہیں اور اس کے آخری سرے پر جبلِ رحمت ہے جس کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اُوپر اور اِرد گرد زائر بارگاہِ عالی میں کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگوں کی عرفات پر حاضری جمعرات کے دن اور جمعہ کی رات تک رہی۔ رات کا تیسرا حصّہ باقی تھا کہ امیرِ عراق کا قافلہ آپہنچا اور نوواردوں نے وسیع میدان میں اپنے خیمے لگا لیے اور آگیں روشن کرلیں۔ پہاڑیوں کے اس تھیٹر میں اور سیاہ نیلی رات میں وہ ایسے لگتے تھے جیسے کہ کوئی فوج پڑاؤ میں ہو۔

"ایسی آہ و زاری۔ ایسی تعبی توبہ اور ایسے عجز و انکسار کا دن پہلے نہیں آیا۔ اس طور سے زائر کھڑے رہے ۔سُورج ان کے بدنوں کو جُھلستا رہا حتیٰ کہ اس کی قرص غروب ہوگئی اور نمازِ عشا کا وقت آن پہنچا۔ امیرِ حج اپنے چند زرہ پوش عسکریوں کی معیّت میں آیا اور وہ چھوٹی مسجد کے قریب کی چٹانوں پر کھڑے ہوگئے۔ سَرو لوگوں نے عرفات پر اپنی مقرر شدہ جگہیں سنبھال لیں جہاں پشت در پشت سے ان کے آبا و اجداد نبی کریمؐ کے زمانہ سے کھڑے ہوتے آئے تھے۔ اور ان کے کسی قبیلے نے اپنے دوسرے قبیلے کی جگہوں پر تجاوز کرنے کے لیے بھگدڑ نہ مچائی۔ اس سال حاجیوں کی گنتی اتنی تھی کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ امیرِ عراق استنے حاجیوں کو لایا تھا کہ پہلے اتنا لاؤ لشکر اس کے ساتھ نہ آیا تھا۔ اس کے ہمراہ خراسان کے غیر مُلکی اُمراء — "خواتین" کے نام سے ملقّب عالی نسب بیبیاں اور اُمراء کی معزز بیٹیاں تھیں۔

عرفات سے واپسی کے لیے ایک مالکی امام کو راہنما اور قائد منتخب کیا گیا کیونکہ حضرت امام مالک کا مسلک کہتا ہے کہ جب تک سُورج

کی قرص پوری طرح اُفق سے نہ ڈوب جائے اور نمازِ عشا کا وقت نہ آجائے عرفات سے واپسی کی اجازت نہیں (اس میں مسلمانوں نے وحدتِ ملّی کا قابلِ تعریف ثبوت دیا) تاہم بہت سے یمنی سَرو پہلے ہی چلے گئے۔ جب وقت ہوچکا تو مالکی امام نے اپنے ہاتھوں کو اُٹھا کر چلنے کی امامت دی اور اپنی جگہ سے اُترا۔ لوگ اپنی واپسی پر ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ایک متلاطم سمندر کی مانند تھے۔ اور ان کے پاؤں تلے زمین کانپ اٹھی اور کہسار متزلزل ہوگئے۔ کیسی حاضری یہ ہوئی تھی! نظر و فکر کے لیے کتنی پُرجلال اور کیا کیا امیدیں آئندہ و شادانِ اَجر کی اس سے ہمارے سینوں میں پیدا ہوگئی تھیں!"

اگلے روز امیرِ عراق کی خیمہ گاہ کی سیر کو جا نکلے۔ اور اس کی شاہانہ آن اور پُرتکلف آراستگی دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ بڑے خُوبصورت خیمے، قناتیں اور قصر نما تنبو اور شامیانے تا حدِ نظر پھیلے ہوئے تھے۔ امیر کے خیمہ کے چوطرفہ ایک کتان کا پردہ تھا جیسے کہ کسی تاک یا مرصّع و منقش حویلی کے گرد دیوار کھینچ دی گئی ہو۔ اس کے اندر گاڑے ہوئے تنبو تھے۔ سفید پس منظر پر کالی رنگت کے اور بوقلموں نقش و نگار سے مزیّن کہ باغ کے رنگین پھول لگتے تھے۔ پردے کی سفید سطح پر سیاہ ڈھالوں کی چھپائی تھی۔ اور اس طرز کی کہ دیکھنے والا سمجھتا کہ زردوزی کیے ہوئے سازوں سے لیس گھوڑوں پر اصلی ڈھالیں رکھی ہیں۔ ان دیوار آسا پردوں میں بلند قلعوں کی طرح اُونچے دروازے تھے جن میں سے آدمی ڈیوڑھیوں اور پُرپیچ بھول بھلیوں میں سے گزرتا اس کھلی جگہ پر آتا تھا جہاں تنبو گڑے تھے ——

"یہ امیر ایک ایسے فصیل دار شہر میں رہتا معلوم ہوتا ہے جو

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس کے کوچ کے ساتھ حرکت میں آجاتا ہے"

دوسرے منصبداروں اور امراء کے خیمے بھی اسی شان و شوکت کے تھے ۔

" جب کوئی امیر سفر میں ہوتا تو وہ اُونٹ کی پیٹھ پر چوبی مرصع پالکیوں میں بیٹھتا جن میں نرم نرم گدیلے اور تکیے رکھے ہوتے ۔ وہ اتنے آرام میں سفر کرتا گویا کہ وہ ایک نرم گدگدے بستر میں محوِ استراحت ہو۔ پالکی کی دوسری طرف وزن پورا کرنے کے لیے اس کا مرد دوست یا رفیق عورت بیٹھی ہوتی اور ان دونوں کے اُوپر رنگین چھتّر کا سایہ ہوتا۔ اس طرح حرکت کے احساس کے بغیر وہ سفر کرتے رہتے یا مزے سے سوتے ۔ باتیں کرتے یا شطرنج کھیلتے ۔ جب وہ اُترنے کے مقام پر پہنچتے تو امیر کے خادم اس کے پہنچنے سے پہلے خیمے گاڑ کر سب انتظام مکمل کر چکے ہوتے ۔ ان کے اُترنے کے لیے سیڑھی لائی جاتی۔ اور وہ اُتر کر اور چھتّر کے سائے سے نکل کر اپنی جائے قیام کے سائے میں پہنچ جاتے "

اور یہ سب کچھ بتا کر ہمارا اُندلسی ایک پتے کی بات چٹکی میں کہہ جاتا ہے ۔

" اور وہ جس کے ذرائع سفر ان آسائشوں کے لیے ناکافی ہوں۔ اسے راستے کی تکالیف و مصائب برداشت کیے بغیر چارہ نہیں جو خدا کے عذابوں کا ایک حصہ ہیں "

ہاں پیارے اُندلسی ۔ نہ صرف سفر میں ہی بلکہ قیام میں بھی غریبی ایک مستقل عذاب ہے ۔

عرفات کے قیام سے فارغ ہو کر دوسری صبح سب زائرِ منیٰ پر شیاطین پر سات پتھر

پھینکنے کے لیے گئے ۔ پھر اُنھوں نے قربانی دی جس کے بعد

" ان کے لیے سوائے عورتوں کے ساتھ سونے اور خوشبو لگانے کے سب کچھ حلال ہو جاتا ہے "

مکّہ میں لوٹ کر طوافِ افاضہ کے بعد ان کا حج مکمل ہو گیا ۔

" عید قربان سے اگلے روز الخفیف کی مسجد میں خطیب نے خطبہ پڑھا اور پھر خطبے کے بعد دوپہر اور ظہر کی ملی جلی نماز پڑھائی ۔ یہ خطیب جسے خلیفہ نے خاص خطبہ پڑھنے اور مکّہ میں قاضی کے فرائض ادا کرنے کے لیے مامور کیا تھا، عراقی امیر کے ہمراہ آیا ۔ اس کا نام تاج الدین ہے۔ یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ ایک ٹھس اور مخبوط الحواس شخص تھا ۔ اس کے بے سرے وعظ سے یہ ظاہر تھا اور اس کی تقریر قواعدِ صرف و نحو سے یکسر بے نیاز تھی "

" تیسرے دن حاجی جانبِ مکّہ اُترنے لگے ۔ اُنھوں نے اُنچاس پتھروں کا پھینکنا پُورا کر لیا تھا ۔ سات پتھر العقبہ میں عید قربان کے روز افعال ممنوعہ سے رہا کرتے ہیں ۔ اکیس دوسرے روز اور اکیس ہی تیسرے دن ۔ پرانے زمانے سے رسم چلی آتی تھی کہ حاجی منیٰ میں ستر پتھروں کی تکمیل کرنے کے لیے عید قربان کے بعد تین دن اور ٹھہرتے تھے ۔ لیکن ابنِ جبیر کے وقت اللہ کی اجازت کے مطابق یہ مدّت دو دن کر دی گئی تھی ۔ (جو کوئی دو دن پتھر پھینک کر جلدی چلا جائے اُس کے لیے کوئی گناہ نہیں اور جو توقف کرے اُس کے لیے بھی کوئی گناہ نہیں") ۔

لوگ منیٰ سے بدوی قبیلہ بنو شیبہ اور مکّی لٹیروں کے خوف کی وجہ سے جلدی لوٹنے کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

کوشش کرتے تھے ۔

"مکّہ کو لوٹنے کے دن مکّہ کے حبشی باشندوں اور عراق کے ترکوں کے مابین جھگڑا ہوگیا، جس میں بعض لوگ زخمی ہو گئے۔ تلواریں سونت لی گئیں ۔ تیر کمانوں کے چِلّوں پر چڑھا لئے گئے اور بھالے ہَوا میں اُڑنے لگے ۔ اس بلڑ میں کئی سوداگروں کا مال لُٹ گیا۔ مِنیٰ میں ان دنوں بڑا بازار لگ جاتا ہے جس میں جواہرات سے لے کر دانوں تک کی تسبیحیں ملتی ہیں ۔ خدا نے ہمیں اس لڑائی کے بُرے نتائج سے محفوظ رکھا اور جلد ہی معاملہ ٹھنڈا ہوگیا ۔ اس طرح عرفات کا قیام بھی بخیر وخوبی ختم ہوا ۔ اور حج مکمّل ہوگیا ۔ سب تعریف دونوں جہانوں کے مالک خدا کے لیے ہے ۔"

قربانی کے روز کسوہ یا کعبہ شریف کا غلاف، چار اُونٹوں پر امیر عراق کی خیمہ گاہ سے لایا گیا ۔ اس کے آگے آگے نیا قاضی تھا وہی جس نے مسجد الخیف میں گرامر کی رُو سے غلط خطبہ دیا تھا ۔ خلیفہ کے دیئے ہوئے حجّی کے سیاہ کپڑے ۔ سردار بنی شیبہ کا ایک چچیرا بھائی بھی غلاف کے ساتھ ساتھ تھا ۔ کسی نے بتایا کہ شیبی سردار محمد ابنِ اسماعیل بحال ہونے کے بعد خلیفہ کے حکم سے دوبارہ برطرف کر دیا گیا تھا ۔ "اللہ اپنے بابرکت گھر کو ایسے خادموں کے ذریعہ پاک رکھے جن پر وہ راضی ہو!" یہ چچیرا بھائی جو بقول ابن جبیر سُلجھے ہوئے راستے پر چلنے والا تھا ۔ اب دوبارہ شیبی سردار بن گیا ۔ کعبہ پر نیا غلاف چڑھایا گیا ۔

"اِن دنوں پاک حرم کا دروازہ روزانہ عراق وخراسان کے غیر ملکیوں اور امیر عراق کے ہمراہ آنے والوں کے لیے کھولا جاتا ہے ۔ ان غیر ملکیوں کی بے نظمی، پاک دروازے پر ان کا پِل پڑنا، ان کی ایک

دوسرے سے ٹکریں، اور ان میں سے بعض کا دوسروں کے سروں پر سے تیرنے کی کوشش کرنا گویا کہ دوسرے لوگ پانی کا جوہڑ ہوں ۔ اس سے زیادہ ہولناک نظارہ کوئی نہیں ہو سکتا ۔ اس میں کئی ہلاک ہوتے تھے اور کئی ہمیشہ کے لیے کانے، لُولے اور لنگڑے ہو جاتے تھے ۔ بابرکت حرم میں یمنی سَرو قبیلے کا داخلہ اور وحشی زبانوں والے غیر ملکیوں کے مقابلے میں گویا تہذیب اور خوش اطواری کا نمونہ تھا ۔ خدا ان کو ان کے نیک ارادوں کا صلہ دے ۔ اس خوفناک دھکم پیل میں وہ افراد تو چل بسے جن کا اس دُنیا میں مقررشدہ عرصہ حیات پورا ہو چکا تھا ۔ خدا ان سب کو ان کے نیک ارادے اور دینی جوش کے لیے معاف کرے ۔ بعض وقت ان کی عورتیں گروہوں کی شکل میں اس بھیڑ میں گُھس جاتیں ۔ جب باہر نکلتیں تو ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے اور ان کے جسم کی جِلد پر زخموں کے نشان ہوتے ۔ خدا ان کو ان کے اعتقاد اور صحیح نیت کا پھل عطا فرمائے ۔"

اُنھوں نے ایک خوبصورت ——— دلنشیں اداؤں کے خراسانی واعظ کا ایک خطبہ سُنا جس نے عربی اور فارسی دونوں زبانیں استعمال کیں ۔ اور اس سے اگلی رات ایک مؤثر پر وقار خد وخال اور سفید مونچھوں والا شیخ منبر نشین ہوا ۔ جو حسنِ بیان اور لطافتِ لفظی میں بے حد ممتاز تھا ۔ اس نے جو خطبہ پڑھا اس میں لفظ بہ لفظ قرآن کی ایک آیت: آیت الکرسی کے جواہر اس خوبی سے ایک لڑی میں پروئے گئے تھے کہ خطبے کے تسلسل میں فرق نہ آتا تھا ۔ اس نے علم کی سب شاخوں کا استعمال کیا اور اتنا پُر تاثیر خطبہ دیا کہ لوگوں کے دِل پانی پانی ہو گئے ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

ابنِ جبیر اور اس کا ساتھی ان مشرقی خطّوں کے واعظوں کی سحر بیانی اور تبحّرِ علمی سے حد درجہ متاثر ہوئے اور شاید وہ خلیفہ کے بھیجے ہوئے اس مخبوط الحواس قاضی کو بھول گئے جو قواعدِ صَرف و نحو سے نابلد تھا۔

اور اتوار کی شام کو کہ ذوالحج کے مہینے کی بیسویں تاریخ تھی اور ماہ اپریل کی تیسری وہ اللہ کے پہلے گھر کو حسرت بھری آخری خیر باد کہہ کر مقامِ زاہر میں امیرِ عراق کی خیمہ گاہ کو چل پڑے۔ اُنھوں نے موصل تک اپنی ٹرانسپورٹ کا انتظام کر دیا تھا۔ دو دن بعد وہ امیر کے قافلے میں مکہ سے روانہ ہو گئے۔

4

قیام مدینہ منورہ

وہ ایک آہستہ اور معتدل رفتار سے سفر کرتے الزاہر سے آٹھ میل کے فاصلے پر بطن مر میں اُترے، جو بہت سے کھجور کے پیڑوں کی ایک شاداب وادی تھی۔ ایک چشمہ ان جھنڈوں میں شر شراتا ہوا بہتا تھا۔ اس وادی میں بہت سے گاؤں اور چشمے تھے اور بہت سے پھلوں سے لدے پھندے درخت!

جمعہ کے دن اُنھیں یہاں ایک عجیب وجہ سے توقف کرنا پڑا۔ وہ یوں کہ شاہی خواتین میں سے ایک خاتون خیمہ گاہ میں اپنے تنبو سے لاپتا پائی گئی۔ یہ خاتون باب سلیشیا، آرمینیا اور بلادِ روم سے ملحقہ خطّوں کے فرمانروا امیر مسعود کی بیٹی تھی اور اُن تین خواتین میں سے ایک، جو امیر حج ابوالمکارم طاشتکین کے ہمراہ آئی تھیں۔ یہ شاہزادہ امیرالمومنین کا فرستادہ افسر تھا جو آٹھ سال سے یہ فرض انجام دیتا تھا۔ شاہزادی کی خواصوں سے پتا لگا کہ رات کو وہ کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر اپنے خانگی خواجہ سراؤں اور خدم و حشم کو جلو میں لیے مکہ کی جانب رُخصت ہو گئی تھی۔ امیر ابوالمکارم نے سُبک رفتار گھوڑوں پر اپنے چند منصبداروں کو اس کے پیچھے دوڑایا تاکہ اس کی واپسی کا پتا کریں۔ وہ بڑے پُراسرار طریقے پر سنیچر کی رات کو لوٹی۔ اور اس ناز پروردہ لاڈو شہزادی کے اس اچانک فرار پر

toobaa-elibrary.blogspot.com

قدرتاً بڑی قیاس آرائیاں اور چہ میگوئیاں ہوئیں۔ لیکن اس کے خیمہ سے یوں چلے جانے اور پھر واپس آجانے کا بھید کسی پر نہ کھلا۔ بعضوں نے کہا کہ وہ امیر ابوالمکارم کی کسی بات سے ناپسندیدگی کی بنا پر چلی گئی تھی۔ دوسروں نے گمان کیا کہ اس کا چلا جانا پاک گھر کے قریب ہونے کی تمنا اور تڑپ کی وجہ سے تھا۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں! گو ہمارا اُندلسی اپنی سنجیدہ مزاجی کی وجہ سے اس سے زیادہ کچھ کہنے کو تیار نہیں، لیکن پڑھنے والا شہزادی کے اس پُراسرار فرار میں الف لیلہ کے کسی ہوشربا افسانے کا مزا محسوس کرتا ہے۔ امیر المکارم کی کونسی بات تھی جس نے اس خودسر شاہزادی کو ناراض کر دیا؟ یا شاید وہ مکّہ میں اپنے کسی چاہنے والے مہجور شاہزادے یا سوداگر کے دل پر تسکین کے پھاہے رکھنے کے لیے گئی تھی۔ ہوگا وہ کوئی دولت مند اور متموّل شخص ہی۔ کیوں کہ شاہزادیاں شاذ و نادر ہی لکڑہاروں یا کف گیروں اور بھٹیاروں سے محبّت کرتی ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ واقعہ بالکل الف لیلہ ہے!

اور یہاں ان شاہی خواتین کی شان و شوکت اور سج دھج کے متعلق بھی چند باتیں معلوم کرلیں۔ یہی لاڈو شاہزادی اپنے ساتھ صرف پوشاکوں، سامانِ آرائش و زیبائش اور خورش سے لدے ہوئے ایک سو اُونٹ لائی تھی۔ اس کی عُمر پچیس برس کی تھی۔ یہ ابنِ جُبیر کو لوگوں سے پتا لگا ہوگا کیونکہ یہ غیر اغلب ہے کہ وہ شاہزادی کو دیکھ سکا ہو۔ دوسری خاتون امیر موصل معزّالدین کی والدہ تھی۔ اس کا شوہر شام کے فرمانروا نورالدین کا بھائی یا بابک تھا (بان بابک)۔ تیسری خاتون ملک خراسان کے اصفہان کے رئیس الدقوس کی دُختر فرخندہ اختر تھی۔" وہ بھی بڑے جاہ و حشم کی مالک ہے۔ اور تینوں خواتین میں دینی کاموں میں شغف اور شاہانہ نخوت کا انوکھا امتزاج ہے۔"

اب آؤ از منہ وسطیٰ کے سب سے بڑے قافلے کو اُندلسی سیّاح کی نگاہ سے دیکھو!

"عراق۔ خراسان۔ موصل۔ ہند اور دُور دراز کے خطّوں کے لوگ جو امیر

حج کے کارواں میں اکٹھے ہوئے تھے گنتی میں اتنے تھے کہ خدائے عرشِ عظیم ہی ان کا شمار کر سکتا ہے۔ وسیع میدان اُن سے پٹا ہوا تھا اور صحرا کی وسعت ان کے سمانے کے لیے ناکافی تھی۔ ان کے پاؤں تلے زمین لرزتی ہوئی محسوس ہوتی۔ ایسا لگتا جیسے ایک بحرِ پُر تموّج و بے کراں ٹھاٹھیں مارتا بڑھا جاتا ہے۔ اس بحر کا پانی یہ مجھ لو صحرائی سراب تھے۔ اس کے جہاز گویا گھوڑا اور شتر سوار! اور اس کے بادبان چھتر اور پالکیاں۔ بادلوں کی مانند وہ ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے۔ ایک دوسرے کو ہٹا کر بڑھتے چلے جاتے تھے۔ اُونٹوں کے کجاوے یوں آپس میں ٹکراتے اور گتھ جاتے کہ دیکھ کر ہول آتا۔ جس نے یہ کارواں نہیں دیکھا وہ وقت کے بڑے عجوبوں میں سے ایک ایسے عجوبہ کی دید سے محروم رہا ہے، جس کا لوگ ساری عمر تک ذکر کرتے ہیں اور جس کی کہانیاں اپنی حیرت سے دلوں کو لبھاتی ہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر تم خیمہ گاہ میں اپنی جائے رہائش سے کسی ضرورت کے لیے نکل جاؤ اور اپنی جگہ پہ پہنچنے کے لیے کوئی نشانی نہ چھوڑ جاؤ تو تم بھٹک جاؤ گے اور تکان سے چُور دوسرے کھوئے ہوؤں کے درمیان روتے پھرو گے۔ بعض اوقات اپنی جگہ پر پہنچنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ راستا بھولا ہوا آدمی امیر کی نشست گاہ میں جا کر فریادی ہو۔ امیر ان حالات میں اپنے ایک نقیب کو ایک اعلان جاری کرنے کی ہدایت دیتا ہے اور ایک ڈھنڈورچی کو کہ اس غرض کے لیے مقرر ہے حکم دیتا ہے کہ اس آدمی کو اپنے پیچھے بٹھا لو اور کل خیمہ گاہ میں گھومو۔ بھولا ہوا آدمی

toobaa-elibrary.blogspot.com

ڈھنڈروچی کو اپنا نام بتاتا ہے اور اپنے میرِ شتر کا بھی، اور یہ بھی کہ وہ کس مُلک سے ہے۔ ڈھنڈروچی پھر اس گم شدہ شخص کو پیچھے بٹھا کر چکر لگاتا ہے اور زور زور سے پکارتا جاتا ہے کہ فلاں فلاں نامی شخص کھویا گیا ہے اور اس کے میرِ شتر کا نام فلاں ہے۔ یہاں تک کہ میرِ شتر کے کان میں یہ آواز پڑ جاتی ہے اور وہ بدنصیب مسافر کو پہچان لیتا ہے۔ ایسا نہ کیا جائے تو گم شدہ شخص کبھی اپنے ساتھیوں میں واپس شامل نہ ہو سکے — یہ اس قافلے کی حیران کن باتوں میں سے ایک ہے —
پھر اس کارواں کے بعض افراد کے پاس اتنی دولت اور اتنا سامانِ آرائش ہوتا ہے کہ ان کی سب ضروریات پلک جھپکتے میں پوری ہو جاتی ہیں۔
املاک خدا کے ہاتھ میں ہیں کہ جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے۔"

آدمی سوچتا ہے کہ کہیں خود ابنِ جُبیر یا اس کے ساتھی احمد بن حسین کو ایسی مضحکہ خیز اور بے وقری کی حالت میں ڈھنڈورچی کے پیچھے بیٹھنے کی نوبت نہ آئی ہو؟ لیکن وہ دونوں کافی محتاط طبع اور ہوشیار شخص تھے۔

اس قافلے میں پانی کی مشکوں اور پیپوں کے اُونٹ بھی ہوتے تھے۔ جب کسی کا پانی کا ذخیرہ ختم ہو جاتا وہ اپنے مشکیزوں اور کوزوں کے ساتھ وہاں جاتا اور اُنھیں بھر لاتا۔ جب قافلے کے کوچ کا وقت ہوتا تو اطلاع دہی کے لیے امیر کی نوبت بجتی۔ ابھی نوبت کی دھمک ہوا میں ہی ہوتی کہ اُونٹ کجاووں اور سواریوں سے لد لدا کر طیار ہو جاتے، اور تیسری ضرب پر قافلہ رواں ہو جاتا۔

رات کو وہ جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں سفر کرتے کہ پیادے ان کو اُونچا کیے ہوتے تھے۔ شاید ہی کوئی کجاوہ ایسا ہوتا ہو گا جس کے آگے ان کا مشعل بردار نہ ہو۔" لوگ ان ستاروں کی مانند چلتی پھرتی مشعلوں کے درمیان سفر کرتے ہیں۔ جن سے رات کا اندھیرا بہت

ہلکا ہو جاتا ہے اور جو سینۂ زمین پر اپنی جھلمل سے آسمانی انجم کا مقابلہ کرتی ہیں۔"

سوموار کو ظہر کی نماز کے وقت وہ خلیقں کے مقام سے روانہ ہوئے اور وادیٔ سمک پہنچے، جس کے معنی ہیں: گہری وادی۔ لیکن جو درحقیقت گہری نہ تھی۔ بدھ وار دوپہر کو اپنے پانی کے ذخیرے کو تازہ کر کے وہ اس وادی سے نکلے اور رات کو ایک مُشکل چٹانی چڑھائی طے کرنے میں ان کے بہت سے اُونٹ جاں بحق ہو گئے۔ وہ ایک میدان میں اُتر آئے اور آدھی رات تک سوئے۔ تاحدِ نظر ایک لق و دق صحرا سامنے تھا۔ اور سڑک، اتنی فراخ اور آسان تھی کہ اُونٹ مہار کے بغیر اس پر اٹھلاتے گئے۔ دن ایک پہر چڑھ چکا تھا کہ وہ بدر میں پہنچے۔

بدر میں پے در پے نخلستان تھے۔ اور اُونچی پہاڑی پر ایک قلعہ! ایک فیاض چشمہ بھی وہاں بہتا تھا لیکن وہ چاہِ قدیم جس کے پاس اسلام کی مشہور جنگ لڑی گئی تھی وہ اب کھجوروں کے تسلّط میں تھا۔ اس چاہِ قدیم کے پیچھے وہ شہدا سوتے تھے جنھوں نے خدا کی راہ میں جانیں دیں۔ وادیٔ الصفرا کو جاتے ہوئے، جبلِ رحمت جس پر فرشتوں نے نزول کیا تھا ان کے دائیں کو رہ گیا تھا۔ جبلِ طبول اس کے سامنے ہی تھا۔ ایک ریتلی ٹیکری کے مانند! اس کے متعلق روایت تھی کہ ہر جمعہ کے روز اس پہاڑی پر سے جنگی نقاروں کی صدا آتی ہے۔ گویا کہ اس جگہ جنّات رسول کی فتح یابی کا جشن مناتے ہیں۔" خدا ان چھُپی ہوئی باتوں کا حال بہتر جانتا ہے"۔ ابنِ جُبیر لکھتا ہے اور وہ ہر روایت کا یقین کر لینے میں محتاط ہے۔ اُنھوں نے جبلِ طبول کے دامن میں وہ جگہ بھی دیکھی جہاں خدا کے رسول کا کنج ایک زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

بدر سے آگے راستا ایک وادی میں تھا۔ جس میں جا بجا تاکستان اور چشمے تھے۔ الصفراء میں ایک اُونچا حصار تھا۔ یہاں سے مدینہ منورہ تک تین دن کا سفر تھا اور سوموار کو آدھی رات کے وقت وہ البیداء میں آئے "جہاں سے مدینہ منورہ نظر آتا ہے"۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور دوپہر کی نماز کے بعد اُنھوں نے مدینہ کے باہر ڈیرے ڈال دیے۔" مدینہ منوّرہ روضۂ ابیض۔ محمدؐ خاتم الانبیاء کے قدموں سے سرفراز ہوئی ہُوئی زمین!"

شام کے وقت اُنھوں نے پاک حرم میں روضۂ پاک کی زیارت کی اور پرانے منبر کے چوبی پاوؤں کو بوسہ دیا جس پر رسولؐ کھڑا ہوا کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے قافلے کے لوگ اپنے خیمے گاڑنے اور اسباب ٹھکانے لگانے میں منہمک تھے، اور اُنھیں حرم میں غور و فکر کرنے اور اس کی تعمیر کا جائزہ لینے کے لیے اطمینان کی گھڑیاں مل گئیں۔ انھوں نے رسولِ خدا کے دو ساتھیوں ــــ الصدیق اور الفاروق پر بھی سلام بھیجا جو وہاں اپنے آقا اور دوست کے پاس ابد کی نیند سوتے تھے۔ خوش نصیب ساتھی! اب ان کے بابرکت سفر کی سب اُمیدیں اور سب مرادیں پوری ہو چکی تھیں اور روضے سے باہر خوش خوش اپنے اسباب کو لوٹتے ہوئے ان کے خیالات اپنے وطن واپس لَوٹنے پر مرکوز تھے۔ غرناطہ کی گلیاں اور فوارے ان کی نظروں کے سامنے آتے تھے۔

مسجد نبوی اور روضہ کی تعمیری خصوصیات کا حال ابنِ جُبیر پوری تفصیل سے دیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی اس کی عاشقانہ اور عالمانہ نگاہیں دیر تک ٹھہری رہتی ہیں۔ یہاں ہمیں بے بسی میں کئی پیرے چھوڑنے پڑتے ہیں۔

" روضۂ مبارک کی چار طرفیں قبلہ کی سمت سے ڈھلان میں اس انوکھے طریق سے ہٹتی ہیں کہ نماز کے وقت کسی کا رُخ روضہ کی طرف ہو سکنا ناممکن ہے۔ شیخ، امام، عالم و متقی، فاضل حکماء کا حرفِ آخر، شارحین کا ستون ابو ابراہیم، اسحاق ابن ابراہیم تونسی روضہ کی زیارت کے وقت ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ

عمر ابن عبدالعزیز نے روضہ کی اس انداز میں تعمیر اس خوف سے کرائی کہ کہیں لوگ روضہ کو نماز کی جگہ نہ بنا لیں اور اس کی پرستش نہ شروع کر دیں ......

...... جنوبی اور غربی گوشوں کے درمیانی طرف ایک پردہ لٹکتا ہے۔ روایت کے بموجب یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت جبریلؑ اُترے تھے۔ رسولؐ کے پاؤں کی طرف ابوبکر صدیقؓ (سچے وفادار) کا سر ہے۔ اور عمر فاروقؓ (جھوٹ سے سچ کو الگ کرنے والے) کا کندھا ابوبکر صدیقؓ کے کندھے کے قریب ہے۔ اس مبارک دیوار پر بیس نقرئی لیمپ لٹکتے ہیں جن میں دو سونے کے ہیں۔ روضہ ایک مرمری نشیب ہے، جس کے جنوبی کونے پر ایک قسم کی محراب ہے۔ روایت کے مطابق یہ رسولؐ کی ذی شان بیٹیؓ کا گھر ہے اور اس کی لحد بھی ہے ...... مسجد نبوی ایک سو چھیانوے قدم لمبی اور ایک سو چھبیس قدم چوڑی ہے۔ اس میں دو سو چھبیس سیدھے پائے ہیں جو چھت تک اُٹھتے ہیں اور ان کے اوپر محرابیں نہیں ہیں۔ مقصورہ کے پاس دو بڑے طاق ہیں کہ جن میں وہ قرآن اور دینی کتابیں رکھی رہتی ہیں جو اس پاک جگہ کو وقف کی گئی ہیں۔ ان طاقوں کے پاس زمین کی سطح میں قبضوں سے جُڑا ہوا ایک مقفّل چور دروازہ ہے۔ یہ ایک زمین دوز غلام گردش کو ڈھانپے ہوئے ہے جس تک سیڑھیوں سے اُتر کر جاتے ہیں اور جو مسجد سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر کو جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اسی راستے سے آتی جاتی تھیں۔ اس گھر کے نزدیک ہی عمر بن الخطابؓ

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور ان کے بیٹے عبداللہ کا گھر ہے ۔
مشرق کی سمت ایک لکڑی کی عمارت ہے جہاں بابرکت مسجد کے
چند محافظ سوتے ہیں ۔ یہ محافظ حبشی جوان اور خوش رو صقلبی غلام
ہیں ۔ نفیس پوشاکوں اور رو پہلے جبّوں میں ملبوس ! ———
پاک مسجد کے اُنیس دروازوں میں سے چار کھلے رہتے ہیں "

اُنھوں نے حضرت حمزہ کی مسجد بھی دیکھی جو احد کی پہاڑی کے جنوب کو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر تھی ۔ اور وہ غار بھی جہاں رسولؐ جا کر رہے تھے ۔

" الغرقد کا گورستان مدینہ کے مشرق کو ہے اور لوگ باب البقیع سے ہو کر یہاں جاتے ہیں ۔ اس دروازے سے نکلتے ہی تمہارے بائیں کو رسولؐ کی چچی حضرت صفیہؓ کی قبر ہے جو حضرت زبیر بن العوامؓ کی والدہ تھیں ۔ ان کی لحد کے سامنے مدنی امام مالک ابنِ انس کی قبر ہے ۔ اس کے دائیں کو عمرؓ بن الخطاب کے ایک بیٹے کی قبر ہے ، جس کا نام عبدالرحمان الاوسط تھا اور لوگ اُسے ابو شحمہ کہتے تھے ۔ یہی وہ بیٹا تھا جسے اس کے باپ نے ایک گناہ کی پاداش میں دُرّے لگوائے تھے یہاں تک کہ وہ اس تکلیف میں مر گیا ۔ پاس ہی عقیل ابنؓ ابی طالب اور عبداللہ ابن جعفر الطیار کی تربتیں ہیں ۔ ساتھ وہ روضہ ہے جہاں رسول رحمتہ اللعالمین کی ازواجِ مطہراتؓ محوِ خواب ہیں . . . . . عباسؓ بن عبدالمطلب ۔ حسنؓ ابنِ علی کے روضے بھی یہیں ہیں ۔ عباسؓ کے روضے کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کا گھر بتایا

جاتا ہے جہاں وہ اپنے والدِ عالی مقام ، وہ جو خدا کا منتخب بندہ تھا ، کی رحلت کے بعد گوشہ نشین ہو گئی تھی ۔ " غموں کا گھر " اسے کہتے ہیں ۔ اس گورستان کے آخر پر دو روشنیوں کے مالک (ذوالنّورین) اور شہیدِ مظلوم حضرت عثمانؓ کا مزار ہے ۔ اور اس کے پاس اسد کی بیٹی اور حضرتِ علی کی ماں فاطمہؓ کا روضہ ! "

کیسے کیسے نام ! اس جگہ رسولؐ اللہ کے بہت سے صحابی ، مہاجر اور انصار دفن تھے اس کے عزیز اور دوست اور ہمسائے ۔ حضرت عباسؓ اور حضرت حسنؑ اور ابنِ علیؓ ۔ اور اس کی پیاری بیٹی فاطمہ اور رسولؐ کے لڑکے ! اسلام کی اوّلین دنوں کی ساری کہانی ان مبارک ہستیوں سے مرتب ہو سکتی تھی ۔ اُمِّ علیؓ فاطمہ کی لحد کے کتبہ پر یہ عبارت کندہ تھی : " کوئی تُربت اسد کی بیٹی فاطمہ کی مثال اپنے بطن میں نہیں رکھتی "

مدینہ پہنچنے کے چوتھے روز وہ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے کہ اُنھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا جو بالکل الف لیلہ کا کوئی سین معلوم ہوتا تھا ۔ اُن کے لیے جو اسلام سے محبّت کرتے تھے وہ فکر انگیز اور افسوسناک تھا ۔ اور ہمارے اُندلسی سیاح اور اس کے دوست کا خون ضرور جوش میں آ گیا ہو گا ۔

شام ڈھل رہی تھی کہ وہی امیر مسعود کی لاڈو بیٹی اپنے خدم و حشم کے ساتھ مسجد اور حرم کی زیارت کے لیے اپنی پالکی میں سوار ہو کر آئی ۔ اس کے ارد گرد اس کی کنیزوں اور خواصوں کی پالکیاں تھیں ۔ قرآن خواں آگے آگے نغمہ سنج تھے ۔ اس کے خدمت گار اور خواجہ سرا غلام لوہے کے سونٹے ہاتھوں میں لہراتے لوگوں کو راستے سے ہٹانے لگے یہاں تک کہ وہ مسجد مقدس میں آ پہنچی ۔ ایک بڑا لبادہ اوڑھے وہ اُتری اور رسولِ کریمؐ

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے سلام کو روضہ کی طرف گئی۔ اس کے خدمتگار آگے آگے راستا صاف کرتے تھے اور مسجد کے عمال اور نگران بلند آواز میں اس کی شہرت کی حمد و توصیف کرتے تھے۔ وہ منبر اور روضۂ مبارک کے درمیان چھوٹے روضہ پر آئی۔ وہاں اس نے اسی طرح لبادے میں ملفوف نماز ادا کی۔ اس کے خدمت گار لوہے کے سونٹوں سے ان لوگوں کو جو اس کے گرد جمع ہوگئے تھے مار مار کر پیچھے ہانکتے جاتے۔ اس کے بعد اُس نے منبر کے پاس حوض میں عبادت کی اور پھر روضۂ مبارک کی غربی دیوار کی طرف جاکر اس مقام میں جا بیٹھی جہاں حضرت جبریلؑ نے نزول فرمایا تھا۔ پھر پردہ اس پر گرا دیا گیا اور اس کے خدمتگار، غلام اور معتمد پردے کے باہر کھڑے ہوکر اس سے احکام لینے لگے۔ وہ اپنے ساتھ مسجد میں خورش کے دو کپ غرباء میں خیرات کرنے کے لیے لائی تھی۔ اپنی جگہ پر وہ رات پڑے تک بندگی کرتی رہی۔

"پھر اعلان ہوا کہ شافعیوں کا امیر صدر الدین اصفہانی کہ پُشت ہا پُشت سے عزّت و تکریم اس کی خاندانی میراث تھی آ پہنچا۔ وہ اس رات یعنی جمعہ سات محرم کی رات کو ایک موعظت و پند کی مجلس کی صدارت کی خاطر آیا تھا۔ اور دیر سے پہنچا جبکہ رات کا ایک حصّہ بیت چکا تھا اور حرم میں عام لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی وہ بازنطینی شاہزادی اس کے انتظار میں تھے۔ اُسے دیر امیر الحج نے کرادی۔ بالآخر وہ امیر کے ساتھ حرم میں آیا، اور ایک تخت جو روضۂ مبارک کے پاس اس افسر العلماء (دین و شرع کے فقیہہ) کے لیے تیار کیا گیا تھا اُس پر جا چڑھا۔ قرآن خواں اس کے سامنے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے اور شیریں ترنّم اور آواز کے پُرتاثیر اُتار چڑھاؤ کے ساتھ قرأت کرنے لگے۔ اس اثناء میں وہ پاک مزار کو دیکھتا تھا اور زار و قطار روتا تھا۔ اس نے ایک خطبہ شروع کیا جو اُس نے خود موزوں کیا تھا اور جس کی فصاحت و بلاغت بڑی مسحور کن تھی۔ وہ

پند و نصیحت کی راہوں پر چلا — عربی اور ایرانی دونوں زبانوں میں — اُس نے پھر خود اپنے گھڑے ہوئے چند ایک پسندیدہ اشعار پڑھے جن میں ایک یہ تھا (جسے وہ روضہ کی طرف ہاتھ اُٹھائے ہوئے رسولِ کریمؐ کے نام آنے پر بار بار دہراتا)۔

یہ اُس کا روضہ ہے نسیم افشاں
صَلّوا علیہ وسلِّموا تسلیماً

پھر اُس نے اس عالی قدر مقام میں اپنی خطاؤں کے لیے گڑگڑا کر معافی مانگی اور کہا: "آہ ایک بدگو اجنبی کی عجیب ہمت! اس کی یہ مجال کہ عربوں میں سے سب سے فصیح عرب کے روبرو زبان کھولے" اور اُس نے خوش ادائی سے روضے کی طرف اشارا کیا۔

اُس نے اپنی موعظت جاری رکھی یہاں تک کہ حاضرین انفعال اور رقت سے بے قابو ہوگئے۔ ایرانیوں نے خود کو اس کے اُوپر ڈال دیا، اپنی توبہ کا وعدہ کرتے ہوئے۔ دل وجد میں از خود رفتہ۔ دماغ چھلنی۔ اُنھوں نے اپنی پیشانی کے بال اس کی نذر کیے اور ایک مقراض منگوا کر اس نے ایک ایک کرکے ہر پیشانی سے ایک لٹ کاٹی۔ وہ اپنا عمامہ اُتار کر ہر اُس شخص کے سر پر رکھ دیتا جس کی لٹ کٹ چکی ہوتی۔ وہ اس کی فیاضی کو جانتے ہوئے اپنے عمامے پیش کرنے میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تاکہ اس طرح وہ اپنے دامن اس کی برکتوں سے بھر لیں۔ اس نے اپنے سر پر سے ایک عمامے کے بعد دوسرے عمامے کو اتارنے کا عمل جاری رکھا حتیٰ کہ وہ بہت سے عمامے اُتار چکا، اور لاتعداد

toobaa-elibrary.blogspot.com

بٹیں اُس نے کتریں ۔پھر اُس نے مجلس ختم کرتے ہوئے کہا :

" میرے اچھے دوستو جو یہاں جمع ہو! میں بڑے اور عظیم خدا کے حرم میں تم سے خطاب کر چکا ہوں اور آج اُس کے رسولؐ کے حرم میں تم سے مخاطب ہوں ۔ ایک خطیب کو اکثر گداگری کرنی پڑتی ہے اور میں تم سے ایک چیز کی بھیک مانگتا ہوں کہ مجھے اس کی ضرورت ہے اور اگر وہ تم مجھے دے دو تو میں اس کا ذکر کرنے میں نہیں شرماؤں گا، سب نے اس کی مدد کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا اور ان کی سسکیاں بلند ہوئیں ۔ 'میری ضرورت' اُس نے کہا 'یہ ہے کہ تم سر اُوپر اُٹھاؤ اور اپنے ہاتھ پھیلاؤ اور اس پاک رسولؐ سے دعا مانگو کہ مجھ گنہ گار کو اپنے دامنِ شفقت میں رکھے اور میرے لیے حشر کے روز ربِ مطلق کے سامنے شفاعت کرے ۔' اور پھر وہ اپنے گناہوں کو ایک ایک کر کے گننے اور ان کا اقرار کرنے لگا ۔ لوگوں نے اپنے عمامے اُتار پھینکے اور رسولؐ کے روضے کی سمت ہاتھ پھیلا کر روتے اور گڑگڑاتے اس آدمی کے لیے دُعا مانگنے لگے —— میں نے اس رات سے زیادہ آنسوؤں اور استغفار کی کوئی اور رات نہیں دیکھی ۔ اس کے جانے کے ساتھ امیر بھی چلا گیا ۔ اور خاتون اپنی جگہ سے رخصت ہوئی ۔ صدرالدین کے آنے پر پردہ اس پر سے اُٹھا دیا گیا تھا اور اپنے لبادے میں لپٹی وہ اپنی خواصوں اور کنیزوں کے درمیان بیٹھی رہی تھی ۔ اور ہم اسے دیکھتے تھے تو اس کے شاہانہ رکھ رکھاؤ اور انداز پر حیرت کرتے تھے ۔ یہ شخص صدرالدین اپنی خاندانی نجابت ۔ جاہ وجلال ۔ اپنے مرتبے کی شوکت، اپنے اطوار کی امیرانہ خوش وضعی ۔ اپنی نمایاں سطوت وحشمت،

اپنے کثیر سامانِ آرائش ، اپنے اَن گنت خدم وحشم اور اپنے پیروؤں کی تعداد کی بدولت بڑا باامتیاز ہے ۔ یہاں تک کہ بادشاہوں کو بھی یہ وقار اور کرّوفر نصیب نہیں ۔ اس کا قصر نما خیمہ ایک بڑے تاج کی مانند فضا میں سر بلند ہے .... اس برگزیدہ شخص کی شان ایسی ہے کہ صفحے کے صفحے اس کو بیان کرنے کے لیے ناکافی ہیں .... ہمیں اس نے ایک صبح شرفِ باریابی بخشا ۔ ہم نے ایک روشن چہرے اور خندہ پیشانی والا شخص دیکھا جس نے بڑی تمکنت اور دبدبے کے باوجود اپنے لطف وعنایت اور نیکی سے ان سب لوگوں کو جو اس کی ملاقات کو آئے تھے بے تکلّف کر دیا ۔ وہ علمیّت اور شخصیّت دونوں میں یکتا تھا ۔ میں نے اور احمد بن حسین نے اس سے اپنی تصنیف کردہ شعر و نثر کی کچھ سطور کی فرمائش کی جسے اُس نے منظور کیا ۔ وہ ان سب میں جنھیں ہم نے ان مشرقی خطوں میں دیکھا ہے عالی نہاد ہے !"

صدرالدین بلاشبہ ایک جادو بیاں مقرر اور ایک محبوب لیڈر ہو گا جس کو شعر و شاعری میں بھی دخل تھا ۔ لیکن اس کی یہ دلپذیری کس قدر اس کی اپنی قابلیت کی مرہونِ منت تھی اور کس حد تک اس کی دنیوی جاہ وحشم اور امارت کی ؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ اگر وہ ایک غریب ٹھٹھیرا اور کفگیر ہوتا اپنی بے اندازہ دولت اور آبائی جاہ و حشمت کے بغیر، تو کیا ابنِ جُبیر اور اس کا دوست اس کی شخصیّت کے اتنے گرویدہ ہوتے؟ ابنِ جُبیر غرناطہ کے شاہزادے کا سیکرٹری ہونے کی وجہ سے سب شاہزادوں اور امیر آدمیوں سے محبّت کرتا تھا ۔ ظاہری شان وشوکت سے متاثر ہو کر وہ آدمیوں کے مصنوعی چہروں کے پیچھے ان کے دل کی گہرائیوں کو بھانپنے کی صلاحیت سے تقریباً عاری تھا ۔ باقی رہا صدرالدین

toobaa-elibrary.blogspot.com

کا خطبہ اور اس کی پُرتصنّع ناٹکی حرکات جو ہمیں قدرے مضحکہ خیز لگتی ہیں، اِس زمانے میں ہم نے یہ بات اس قدر اپنے خطیبوں اور قوم و ملّت کے قائدوں میں دیکھی ہے کہ یہ ہمیں قطعاً متاثر نہیں کرتی۔ سادہ جوشیلے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے والے مارک انٹنی اب بھی بہت ہیں۔ اور عظیم لوگ وہ نہیں جو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ شور برپا کرتے ہیں بلکہ وہ چپکے سے، خاموشی سے، دیانتداری سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور دُنیا ان کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ نپولین کے جنگی کارنامے اور شہنشاہی کروفر کے قصّے اب بھلائے جا چکے ہیں مگر ایک غریب اصطبل کے نگران کے بیٹے کیٹس۔ جو جوانا مرگ اور نامراد اِس دُنیا سے رُخصت ہوا۔ کے سانیٹ ہمیشہ زندہ رہیں گے!

اس کے باوجود ممکن ہے صدرالدین ایک اچھا آدمی ہو جس کا دل واقعی دردِ آشنا ہو، کیونکہ سب امیر آدمی بدخصلت نہیں ہوتے۔ ہم کیا جانتے ہیں؟ لیکن اگر وہ عظیم ہوتا تو کیا اس کا خیمہ فضا میں تاج کی طرح سر بلند ہوتا؟ کیا وہ عمر بن الخطاب فاروقؓ کی طرح اپنی گھر کی کاتی ہوئی چادر میں کندھے پر مشکیزہ رکھے مسجد کے کوزوں میں پانی نہ بھر رہا ہوتا؟!

اگلی رات ایک بالکل مختلف قسم کے خطیب سے ان کا سابقہ پڑا۔

"جمعہ سات محرم کو ہم نے ایک ایسی ملحدانہ بدعت دیکھی کہ اسلام کو اس کے خلاف جہاد میں اُٹھ کر للکارنا چاہیے۔ اے اللہ! مسلمانوں کی خبر لے! بدعت یہ تھی کہ ایک خطیب وعظ کرنے آیا اور رسولِ خدا کے منبر پر چڑھا۔ روایت تھی کہ یہ شخص ایک ایسے راستے کا پیروکار تھا جسے لوگ ناپسند کرتے تھے۔ اس ایرانی شیخ اور امام کے راستے سے بالکل

علیحدہ جو مسجد نبوی میں فرضوں کی امامت کرتا تھا اور جس کا طریقہ راستبازی اور دینداری کا تھا کہ ایسی مسجد کے امام کا ہونا چاہیے۔ جب مؤذّن اذان دے چکے تو یہ خطیب خطبہ پڑھنے کے لیے اُٹھا۔ دو سیاہ عَلَم کہ اس سے پہلے لائے گئے تھے منبر کی اطراف پر رکھے تھے۔ اور یہ خطیب ان کے درمیان کھڑا تھا۔ جب اُس نے خطبے کا پہلا حصّہ ختم کر لیا تو وقفے کے لیے بیٹھ گیا۔ دو خطبوں کا درمیانی وقفہ جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے بالکل مختصر ہوتا ہے مگر یہ خطیب آرام سے بیٹھا رہا۔ اور مسجد کے نگرانوں اور مجاوروں کی ایک بدتمیز ٹولی دریدہ دہنی سے آگے بڑھی اور نمازیوں کی صفوں میں گھُس کر، ان کی گردنوں کو لتاڑتی، ایرانیوں اور دوسرے لوگوں سے جو وہاں موجود تھے اس نااہل خطیب کے لیے خیرات کا تقاضا کرنے لگی۔ بعضوں نے اپنے بیش قیمت لبادے اُتار پھینکے۔ دوسروں نے ریشم کے قیمتی کپڑے جو اُنھوں نے اس مقصد کی خاطر تیار کر رکھے تھے بڑھا دیے۔ کیٹوں نے اپنے عمامے اُتار کر خیرات کی جھولی میں ڈال دیے۔ چند بے چارے ہم جیسے بھی تھے جن کے فرغل اُتروا لیے گئے۔ بعض غریب لوگوں نے موٹی چھینٹ کے ٹکڑے دے دیے۔ بعض نے سونے کے درہم دیے۔ بعض نے ایک دو دینار، اور بعض نے کوئی شے۔ عورتوں نے اپنے نقرئی پازیب اُتار پھینکے۔ چھلّے۔ کنگن اور کانوں کے بالے، الغرض ہر ایک کو شرما شرمی اور دیکھا دیکھی کچھ نہ کچھ دینا پڑا۔ اس سارے عرصے میں خطیب منبر بیٹھا رہا۔ اُن پر جو اس کی خاطر اس تندہی سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

نمازیوں کی صفوں میں مشقت کر رہے تھے لالچ اور ندیدے پن کی نگاہیں ڈالتا ہوا۔ اور اپنی حرص سے وقتاً فوقتاً نمازیوں کو زیادہ فیاضی سے دینے کی تلقین کرتا اور خیرات کے فضائل قرآن کے حوالے سے بتاتا ہوا! اتنے میں نماز کا وقت قضا ہونے لگا اور دیندار اور سچے آدمی اس لُوٹ پر زور زور سے احتجاج کرنے لگے۔ خطیب جس کے چہرے پر شرم وندامت کا شائبہ تک نہ تھا اُسی طرح خیرات کے آخری قطرے کو سمیٹنے کے لیے مطمئن بیٹھا رہا۔ اس خلافِ شرع تجارت سے اس کے سامنے ایک بڑا سا ڈھیر جمع ہو گیا۔ اور جب اس کی طمع کو اس ڈھیر سے قدرے تسکین ہوئی تو خدا خدا کر کے خطبہ کا وقفہ ختم ہوا۔ اور اس نے اُٹھ کر باقی خطبہ پڑھا۔ روشن خیال آدمی یہ حال مسجد نبوی میں دیکھ کر دین کے لیے روتے تھے۔ اور قیامت کے آثار دیکھتے تھے۔"

اور جب آخر مدینہ منورہ اور روضۂ مبارک سے چلنے کی گھڑی آئی تو وہ بچوں کی طرح رو پڑے۔ لوگوں کے دل پاک رسول اور اس کے دوستوں، عزیزوں اور جاں نثاروں سے جُدا نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ابنِ جُبیر نے کہا؛

میری محبت چاہتی ہے کہ میں یہیں ٹھہر جاؤں!

لیکن میرے حالات مجھے سفر کی راہ پر ڈالے دیتے ہیں۔

اور مدینہ کے دروازے پر پہنچ کر اور وہاں سے رُخصت ہوتے وقت اُس نے جو پُر سوز نعتیں کہیں اُن میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد بھی ہے، فصیح عربی، لڑھکتے ہوئے

toobaa-elibrary.blogspot.com

مقفیٰ بندوں میں، جواب عربی نعتیہ شاعری کی لازوال چیزوں میں سے ہے!

سنیچر آٹھ محرم۔ اکیس اپریل کو ایک گھڑی دن چڑھے۔ رُسول خدا کے شہر میں کل پانچ دن کے قیام کے بعد —— اُنھوں نے قافلے کے ساتھ عراق کی جانب واپسی کے سفر کے لیے کوچ کیا!

5

مدینہ منوّرہ سے بغداد

بغداد

آؤ اب اس متمدن اُندلسی کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کی سب سے بڑی سڑک پر بغداد کا سفر کریں۔ ہم جلدی میں ہیں کیوں کہ ہمارے سفر کا مبارک مقصد پورا ہو چکا ہے اور غرناطہ کے پیچدار فواروں سے دُھلے کُوچے ہمیں بُلا رہے ہیں۔ تاہم یہ ایک لمبا سفر ہے پُرکٹھن اور خطرات سے بھرا ہُوا اور پیشتر اس کے کہ ہماری آنکھیں اُندلس کے محبوب ساحل کو دیکھ سکیں۔ ہم نے کئی اجنبی دیسوں اور نامعلوم سمندروں کو طے کرنا ہے، موت کو کئی بار رُو در رُو ملنا ہے اور اگلے محرم کے پہلے چاند کو ایک جہاز کے عرشے پر سے دیکھنا ہے۔

اسی سڑک پر چھ سو سال بعد ایک اور بڑا سیاح - بارِیش - بڑی اور جلتی آنکھوں والا انگریز ڈاٹی Doughty کہ اور مدینہ جانے کے لیے چلا تھا۔ وہ عجیب انگریز ایک بدّو کی سی فصاحت کے ساتھ انگریزی بولتا تھا - اور گو وہ اپنی منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکا - اس نے ایک بہت بڑی قوم پر ایک بہت بڑی کتاب لکھی - اور یہ سڑک اس کے اس سفرنامہ کے لازوال صفحوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہے۔

سوموار کو اُنھوں نے وادی العروس میں پڑاؤ کیا اور وہاں سے نجد کی سرزمین میں چڑھے۔ اُنھوں نے نجد کی اُن جانفزا ہواؤں کے سانس بھرے جو ضرب المثل بن چکی ہیں اور ان کے دماغ اور جسم ان ہواؤں اور اس نسیم کی فرحت بخشی سے تازہ ہو گئے۔ اپنے سفر کے

چوتھے دن وہ ایک پانی کے مقام العُسیلہ میں اُترے اور پانچویں دن وہ نقرہ کے مقام میں ٹھہرے جہاں چشمے اور بڑے وسیع حوض تھے۔ ان حوضوں میں سے ایک مینہ کے پانی سے بھرا ہوا تھا اور تمام قافلے نے اس میں سے پانی نکالا لیکن پھر بھی پانی میں کوئی کمی نہ آئی۔

سفر کے چھٹے دن وہ القارورہ کے مقام میں ٹھہرے - یہاں بھی برساتی پانی سے بھرے ہوئے وسیع حوض تھے۔ القارورہ نجد کی سرزمین کے ایک گوشے میں تھا۔ ابنِ جُبیر لکھتا ہے :

> "کسی آباد ملک میں مَیں نے کبھی اتنا وسیع اور بار آور علاقہ نہیں دیکھا یا جس کی ہوائیں اس سے زیادہ عطر بیز اور صحت بخش اور معتدل ہوں۔ جس کے آسمان اتنے اُجلے ہوں - زمین اتنی پاک صاف ہو .....
>
> جمعرات کی صبح کو ہم الحاجر میں اُترے جہاں پانی حوضوں میں اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اکثر اسے کھود کر چھوٹے گڑھوں میں سے بھی نکالتے ہیں - اس سڑک پر ہمیں پانی کی کمیابی کا ڈر تھا خصوصاً اس لیے کہ آدمیوں اور اُونٹوں کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ پانی کا دریا بھی ہوتا تو ختم ہو کر خشک ہو جاتا - لیکن خدا نے اپنے مہر سے بادلوں میں سے وہ چیز بھیجی کہ جس نے اس نشیبی میدان کو ایک جھیل میں تبدیل کر دیا - ہاڑ کے پانی اپنے نالوں میں پھُوٹ نکلے اور وادیاں بہار کی بارشوں سے بھر آئیں - اسی روز الحاجر پر ہم نے دو چڑھی ہوتی ندیوں کو عبور کیا - جو ہڑ اور دلدلیں بے حساب تھیں - جمعے کو علی الصبح ہم سمیرہ میں اُترے جس کے میدان میں ایک قسم کا حصار تھا - ایک بڑا احاطہ اس کے گرداگرد تھا جس میں لوگ بستے تھے - اس کے بہت سے کنوؤں کا پانی کھارا تھا - یہاں بدّو لوگ اپنی پیداوار گوشت مکھن اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

"دُودھ کا مبادلہ کرتے ہیں - حاجی، گوشت کے لیے بھوکے اور دودھ کے پیاسے، انھیں خریدنے دوڑتے ہیں اور ان کے بدلے کوری چھینٹ کے تھان بدوؤں کو دیتے ہیں جو اس کے علاوہ کوئی اور چیز قبول نہیں کرتے "

اتوار کو وہ فَید میں آئے - فید زمین کے ایک ہموار میدان میں برجوں اور میناروں کا ایک بڑا حصار تھا جس کے گرد ایک فصیل دار بستی تھی - یہاں بھی بدو رہتے تھے - جن کا گزارہ حاجیوں کے ساتھ تجارت اور مبادلے وغیرہ پر تھا - غالباً وہ حاجیوں کو کبھی کبھار مناسب موقع مل جانے پر لُوٹ بھی لیتے تھے - حج پر جاتے ہوئے کئی زائر اپنے توشے اور خوردش کا کچھ حصہ اپنے کسی بدو واقف کار کے پاس احتیاطاً چھوڑ جاتے تاکہ واپسی پر ان کا اناج ختم ہو جائے تو اپنی امانت لے لیں - اور بھوکوں مرنے سے بچ جائیں - فَید کے بدو بڑے مہذّب اور ایمان دار ہوں گے کہ حاجی ان پر اعتبار کر لیتے تھے - غالباً ایسا وہ امیر مُکثر کے ڈر سے کرتے ہوں گے جو مکّہ میں حاجیوں کی آمد کا ایک حریص بھیڑیے کی طرح منتظر ہوتا اور جو بدوؤں سے بڑھ چڑھ کر بے اعتبارا تھا - فَید کے بدو امیر کے مقابلے میں گویا استغناً اور مروّت کے پُتلے تھے -

اس کے باوجود امیرِ حج فید میں دھوم دھام سے داخل ہُوا — جنگی طبل بجاتا قرنا پھونکتا، سب لشکری پرے باندھے اور ہتھیار سجائے - جیسا کہ اہلِ فَید کے خلاف کوئی جہاد ہونا ہو - اس کا مطلب یہ تھا کہ بدوؤں کے دل میں ہول طاری ہو جائے اور اگر اُن کے ارادے شریفانہ نہ ہوں تو وہ اُنھیں بدل دیں - بدوؤں نے حاجیوں کے خیمے پر گرسنہ، حریصانہ نگاہیں دوڑائیں لیکن اس کے قریب پھٹک سکنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی - خیمے کے چاروں طرف راہواروں کی پیٹھ پر خطرناک اور مسلح ترکیوں کا پہرہ تھا - دوسرے دن بدو زرِ مبادلہ کی خاطر خیمہ گاہ میں آئے - اور ہر ایک شخص نے اپنی حیثیت

اور مقدور کے مطابق بھیڑیں اور مینڈھے خریدے - بدو ان میرانِ شتر کے لیے اُونٹ اور سانڈنیاں بھی لائے جو راستہ کے لیے اُنھیں خریدنا چاہتے تھے - مکھن، شہد اور دُودھ بھی ہر ایک نے لیا - اور بدو کوری چھینٹ کے تھانوں سے لد لدا کر اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

محرم کے اٹھارھویں دن جو مئی کی پہلی تاریخ تھی وہ الاجفُر میں اُترے - یہ جگہ عُذری قبیلے کے رومانی جوڑے جمیل اور بُثینہ کی وجہ سے مشہور تھی - زرود القصر میں سے ہوتے وہ الثعلبیہ میں پہنچے - جہاں ایک بہت بڑا پانی کا حوض تھا -

"الثعلبیہ کے پانی کے سٹیشن پر ہم نے لوگوں کے درمیان پانی کے لیے اتنی بڑی لڑائی دیکھی کہ ایسی شہروں اور حصاروں کے قبضے کے لیے بھی نہیں ہوتی - اتنا کہنا کافی ہے کہ اس حوض پر سات آدمی دھکم دھکے میں پاؤں کے نیچے آ کر روندے گئے اور جاں بحق ہوئے وہ جلدی سے پانی پینے گئے اور جامِ مرگ نوش کرنے میں کامیاب ہوئے - خدا اُن پر مہر کرے اور اُنھیں معاف فرمائے "

جمعہ کو وہ "برکۃ المرجوم" یعنی "سنگسار کیے ہوئے جوہڑ" پر آئے -

"یہاں ایک حوض ہے جس میں پانی بڑی دُور سے ایک کاریز کے ذریعے لایا جاتا ہے جو زمین کے اوپر اونچائی پر اتنی عمدگی سے تعمیر شدہ ہے کہ بڑی دولت اور وسائل کا پتا دیتا ہے - سنگسار کیے ہوئے آدمی کی قبر سڑک کے ایک طرف ایک اُونچی پہاڑی کی طرح ہے کیونکہ سب گزرنے والے اس پر پتھر پھینکتے ہیں - یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے کسی جُرم کی پاداش میں اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا - اللہ بہتر جانتا ہے .... یہ حوض، جوہڑ، کنوئیں اور سڑک پر اسٹیشن خلیفہ ہارون الرشید کی چچیری بہن اور ملکہ جعفر ابن ابی جعفر المنصور

toobaa-elibrary.blogspot.com

کی بیٹی زبیدہ کی یادگاریں ہیں۔ جس نے عمر بھر خود کو اسی نیک کام میں لگائے رکھا۔ اور اس نے اس سڑک پر اتنی سہولتیں مہیا کیں اور اتنے رفاہِ عام کے کام کیے کہ اس کی وفات سے لے کر اس زمانے تک حاجی اور مسافر ان سے فیض یاب ہوتے ہیں"۔

وہ الشقوق میں آئے۔ جہاں حوض میں پانی پورے دو آدمیوں کے قد کے برابر گہرا تھا اور کئی لوگ اس میں تیرتے اور نہاتے رہے۔ رات کو وہ التنانیر (آگ کی بھٹی) میں اُترے۔ التنانیر سے عقبۃ الشیطان پہنچے۔ وہاں سے واقصہ، بلورہ، منارۃ القرون، قادسیہ ہوتے (ان سب جگہوں پر حوض تھے اور بدو خورد و نوش کی چیزیں چھینٹ کے بدلے مہیا کرتے تھے) وہ النجف آئے جو الکوفہ کے شہر اور صحرا کے درمیان ایک حد بندی کا کام دیتا ہے۔ قدیم الکوفہ ایک بڑا شہر تھا، فصیل کے بغیر اور تباہی اس کے ویران گلی کوچوں اور گرتے پڑتے محلوں میں اترا کے چلتی تھی۔ الکوفہ آباد سے زیادہ غیر آباد تھا۔ وہ وہاں کی پاک مسجد کو دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ ایک بڑی وسیع مسجد تھی، پانچ غلام گردشیں جنوبی سمت پر اور دو دوسری طرف۔ سخت منقش پتھروں کے ستون جن کے پتھر کی سلیں پگھلے سیسے سے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں، بلند بام چھت کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ محراب کے پاس اُنھوں نے وہ حجرہ دیکھا جو خدا کے دوست ابراہیم کا عبادت خانہ تھا۔ اس پر ایک سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا اور خطیب جب خطبہ پڑھنے کے لیے آتا تو اپنی سیاہ پوشاک میں اسی پردے کے پیچھے سے برآمد ہوتا۔ قبلے کے دائیں کو ایک محراب تھی۔ ایک ساگوان کے کٹہرے سے محدود اور ایک ننھی سی مسجد کی مانند پختہ چھتے پر سے اُٹھی ہوئی۔

"یہ مسلمانوں کے امیر علی ابن ابی طالب (خدا اس پر مہر کرے) کی محراب ہے۔ اور اس جگہ پر اس ملعون کم بخت عبدالرحمٰن ابن مُلجم نے اس پر تلوار کا وار کیا تھا۔ لوگ یہاں رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں۔ اس جنوبی

غلام گردش کے سرے پر ایک کونے میں ایک چھوٹی سی مسجد اسی قسم کے ساگوانی کٹہرے کے اندر ہے جہاں پر وہ پانی زمین کے ذخیرے میں سے پھوٹ پڑا، اور نوح نبی کے لیے وہ ربانی معجزہ ظہور میں آیا۔ اس کے عقب میں مسجد سے باہر وہ گھر ہے جس میں نوح نبی رہتا تھا۔ اور اس کے پیچھے ایک اور خانہ ہے جس میں ادریسؑ نبی عبادت گزاری کرتے تھے۔ ان دو حجروں سے ملحقہ ایک کشادہ جگہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ نوحؑ نے اپنی کشتی یہاں بنائی تھی۔ اس کے سرے پر علی ابن ابی طالب کی اقامت گاہ ہے اور وہ گھر جس میں اس کا جسم آخری بار نہلایا گیا تھا۔ اس سے ملحق نوحؑ نبی کی بیٹی کا گھر ہے۔ یہ محترم روایات ہم کو اس علاقہ کے ایک شیخ سے معلوم ہوئیں اور ہم نے ان کو جُوں کا تُوں لکھ دیا ہے۔ خدا ان سب کی صداقت کے متعلق بہتر جانتا ہے"۔

سینچر کو وہ الکوفہ ۔ کھنڈرات کے شہر ۔ سے چل پڑے اور دوپہر کو اُنھوں نے دریائے فرات کی ایک نہر کے کنارے قیام کیا۔ دریائے فرات الکوفہ سے مشرق کو آدھ فرسنگ کے فاصلے پر بہتا ہے اور جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی کھجوروں کے گھنیرے جھنڈ شہر سے لبِ دریا تک چلے گئے تھے۔ اتوار کو وہ الحلّہ میں داخل ہوئے۔ الحلّہ الکوفہ سے ہر لحاظ سے بہتر شہر تھا لیکن اس کی فصیل بھی منہدم ہو چکی تھی۔ مشرقی طرف پر فرات اس کی حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کو چُومتا تھا۔ اس کے بازار شاندار تھے، یہ محکم بنا ہوا تھا اور نہایت آباد۔ شہر کے باہر اور اندر کھجوروں کے جُھنڈوں میں متموّل شہریوں کے مکان تھے۔ یہاں اُنھوں نے فرات پر ایک بڑا مہیب پُل دیکھا جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی لمبی کشتیوں پر بنا تھا۔ کشتیاں بڑی آہنی زنجیروں سے باہم جوڑی ہوئی تھیں

toobaa-elibrary.blogspot.com

بٹے ہوئے شہتیروں کی طرح مہیب ۔ دونوں کناروں پر لکڑی کے مضبوط کھمبے تھے جن سے یہ زنجیریں بندھی ہوئی تھیں ۔ اُندلسی سیاح اور اس کا دوست اس عظیم الشان پُل کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے ۔ یہ پُل خلیفہ الناصر لدین اللہ نے حاجیوں کی سہولت اور آرام کے لیے تعمیر کرایا تھا ۔ اُنھوں نے فرات کو عبور کیا اور الحلّہ سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر خیمے اور ڈیرے ڈال دیے ۔

وہ آدمی واقعی بے روح ہے جو کسی دریا کے ساتھ محبّت نہیں رکھتا —— اور پھر فرات ایسے دریا سے کہ باغِ عدن کی ایک ندی ہے ! تو سنو کہ اُندلسی سیاح اس کا ذکر کیسے کرتا ہے :

" یہ دریا اپنے نام فرات کی طرح ہے ۔ پانی اس کا شیریں ترین اور خُنک ترین ہے ۔ یہ ایک بڑا دریا ہے جس میں جہاز آتے جاتے ہیں ۔ الحلّہ سے بغداد تک کی سڑک دُنیا کی بہترین اور خوبصورت ترین سڑکوں میں سے ہے ۔ شاداب میدانوں اور مسکراتے کھلیانوں کے بیچ میں سے یہ جاتی ہے اور اس کے دونوں طرف آبادیاں ہیں ۔ ان میدانوں کی آبپاشی فرات سے نکالی ہوئی نہروں سے ہوتی ہے کہ ان کے درمیان بہتی ہیں اور انتہائے نظر تک سبزہ ہی سبزہ لہلہاتا ہے . . . . . اس سڑک پر آنکھیں شادمانی سے سیر کرتی ہیں اور دل مسرّت اور صحت سے بھرپور ہو جاتے ہیں اور اس راستہ پر سلامتی ہمیشہ مسافر کی ہم رفیق ہوتی ہے ۔"

وہ فرات کے کنارے حلّہ میں تھے کہ نئے مہینے صفر کا چاند نکلا ۔ اگلے روز وہ

وہاں سے روانہ ہوئے ۔ اور فرات کی ایک شاخ النیل کو ایک پُل پر سے پار کیا ۔ ہجوم کی دھکا پیل میں سے بہت سے آدمی اور جانور پُل پر سے ندی میں جا پڑے اور جاں بحق ہو گئے ۔ ہمارے سیاح محتاط تھے وہ ایک طرف کھڑے ہو گئے اور جب ہجوم کم ہو گیا ۔ تو وہ اطمینان سے پار گئے ۔ الحلّہ ہی سے قافلہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا ۔ حاجی گروہوں اور جتھوں میں بٹ گئے ۔ بعض آگے نکل گئے ۔ بعض وسط میں تھے اور کئی جو جلدی میں نہ تھے پیچھے رہ گئے ۔ اب یہ حالت تھی کہ وہ جو جلدی میں ہوتا تساہل پسند کا انتظار نہ کرتا ۔ اور قافلے کے ہراول دستے پیچھے آنے والوں کے لیے نہ رُکتے ۔ بلکہ جہاں وہ چاہتے دم لینے اور سستانے کے لیے ٹھہر جاتے اور اب طبل کا ڈر ان کے دلوں سے جاتا رہا جس کے بوقت روانگی اور قیام ، بجنے پر ، وہ پہلے ہڑبڑا اُٹھتے تھے ۔ اب سڑک محفوظ تھی اور جا بجا فرات کی نہروں پر پُل تھے اور فواروں کی بہار تھی ۔ کئی پُلوں پر سپاہیوں اور پہرہ داروں کے خیمے تھے تاکہ بھک منگے اور چور اُچکے حاجیوں کو تنگ نہ کریں ۔

امیرِ حج طاشتکین الحلّہ میں تین دن ٹھہرا رہا ۔ جب سب حاجی اس سے پہلے گزر گئے تو وہ خلیفہ کی بارگاہ میں حاضری کے لیے روانہ ہو گیا جس کی طرف سے وہ حلّہ کے صوبے پر حکومت کرتا تھا ۔ " حاجیوں سے تلطّف ، ان کی خبر گیری اور اپنے ہراول اور پچھلے کی نگہبانی میں اس امیر کا رویّہ قابلِ تعریف ہے ۔ وہ استقلال اور پیش اندیشانہ تدبّر کی راہ پر چلتا ہے اور اخلاق ، تہذیب اور مروّت میں اس کا طریقہ مستحسن ہے ۔ خدا اسے اور اس کے توسّط سے کل مُسلمانوں کو اجر دے ۔"

وہ القنطرہ اور زریران کے خوبصورت گاؤں میں ٹھہرے جن کی زمینیں نہروں کی آبپاشی سے زرخیز اور سرسبز تھیں ۔ اور جن میں پھلدار درختوں کے باغ اور تاک تھے ۔ زریران کے ایک طرف فرات بہتا تھا ۔ دُوسری طرف دجلہ اور ان دو دریاؤں کے درمیان ایک

toobaa-elibrary.blogspot.com

نئی نویلی دُلھن کی طرح یہ گاؤں آباد تھا۔ اُنھوں نے یہاں ایوانِ خسرو کے کھنڈرات بھی دیکھے۔ اور زریران سے ایک فرسنگ آگے وہ حضرت سلمان فارسی کے مزار پر بھی رُکے۔

"ہم نے سنا تھا" ابنِ جُبیر لکھتا ہے "کہ بغداد کی ہَوا دل میں انبساط پیدا کرتی ہے اور رُوح میں جولانی اور زندہ دلی جگاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس ہوا میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو خوش باش اور بے فکرا نہ ہو خواہ وہ اپنے وطن سے دُور کوئی پردیسی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے جب ہم زریران میں اُترے جو بغداد سے ایک منزل پر ہے اور اس کی عطر بیز ہوا کے سانس بھر چکے اور اس کے ٹھنڈے پانیوں سے پیاس کی جلن بُجھا چکے تو ہم نے اپنی پردیس کی تنہائی کے باوجود خوشی کے بلاوے کو محسوس کیا اور اپنے کٹھن رستے پر ہم نے مسّرت۔ اجنبیوں کے وطن لوٹنے کی مسرّت ۔ اپنے دلوں میں پُھوٹتی پائی، ایک شادمانی کی کیفیت ہماری رگ رگ میں رچ گئی۔ اور ہمیں عالمِ جوانی میں محبّت کرنے والوں کی پُر بہار ملاقاتیں یاد آگئیں۔ اگر وطن سے دُور ایک پردیسی کے اندر اتنی زندگی پڑ جاتی ہے تو اس حاجی کا کیا حال ہوتا ہوگا جو اپنے گھر اور عزیزوں کی طرف لوٹ کر آرہا ہو۔ اس کے تو قدم بھی زمین پر نہ ٹکتے ہوں گے۔

[خدا نے باب الطّاق کی بارش سے بھرے بادلوں سے آبپاشی کی اور ہر پردیسی کو اپنے دیس میں لوٹا دیا۔]

بُدھوار کی سہ پہر کو وہ باغوں اور ہرے بھرے مرغزاروں میں سے گزرتے آخر کار الف لیلہ کے شہر میں داخل ہوئے۔ مدینہ منورہ سے چل کر یہاں تک سفر میں ان کو پچیس دن لگے تھے۔

انھوں نے بغداد کو امریکن ٹورسٹوں کی کاملیّت سے 'کیا'، اور دیکھا۔ بغداد کے شہر نے اُنھیں کچھ مایوس کیا جیسا کہ کئی جدید سیاح جو وہاں بڑی بڑی توقعات لے کر اور الف لیلہ کو ذہن میں بسا کر جاتے ہیں اور مایوس اور برہم ہوتے ہیں۔ شاید وہ تجمل اور وہ رنگینی جو الف لیلہ لکھنے والوں نے اس شہر کو اپنی ہوشربا سحر کاری سے عطا کی ہے' بھی یہاں نہیں تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے وقتوں میں بھی نہیں۔ بغداد غالباً ہمیشہ سے قوسِ قزح کی طرح کچھ دُور ہی سے بھلا معلوم ہوتا رہا ہے آدمی کو اپنے خوابوں کے شہروں میں کبھی نہ جانا چاہیے کیونکہ وہاں مایوسی اس کی منتظر ہوگی۔

اگر ابنِ جُبیر اور احمد بن حسین جوانی کی چمک میں ہوتے اور اتنے سنجیدہ اور دین دار شخص نہ ہوتے۔ تو اس تیرہ دن کے قیام میں اُن کی مصروفیات بالکل دوسری قسم کی ہوتیں کیونکہ بغداد تب بھی ایک بڑا رنگین شہر تھا۔ سند باد جہازی جیسے جوہری اب بھی اس کے شاندار بازاروں میں بیٹھتے تھے اور شام کو اپنی دکانیں بڑھا کر اپنی غزال چشم اور گداز جسم محبوباؤں کے ساتھ چاندنی رات میں دجلہ پر کشتی کی سیر کرتے اور صراحیوں میں سے بادہ کے خُم لنڈھاتے تھے۔ شہر میں کئی ایسی سرائیں اور گھر تھے جہاں رات کو جام گردش میں آجاتے اور کولھے مٹکانے والی غیر ملکی عورتیں جذبات کو برانگیختہ کرتیں۔ لیکن ہمارے دونوں سیاحوں نے عاقبت کے خوف سے اپنے دامن کو ان باتوں سے بچائے رکھا اور جنّت کے وعدۂ حور و شرابِ طہور کو بغداد کی عیش کوشی پر ترجیح دی۔ وہ دونوں پرہیزگار اور خُدا ترس آدمی تھے۔ اُنھوں نے اپنی نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھا۔ یہ نہیں کہ ابنِ جُبیر نگاہِ ناز اور دلرُبائی کی ادا کے سامنے پتّھر تھا کیونکہ وہ بغداد کی عورتوں کے حُسن سے بے حد متاثر معلوم ہوتا ہے۔ "بغداد کی عورتوں کا حُسن" وہ اپنے وقائع میں لکھتا ہے:

toobaa-elibrary.blogspot.com

"اس کی ہوا اور دجلہ کے پانیوں سے دُھلا ہوا سارے عالم میں شہرۂ آفاق ہے۔ جذبات پر اس کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ خدا اس کی فتنہ سامانیوں سے اجنبی کو محفوظ نہ رکھے تو اس کے لیے محبت کی ورغلاہٹ اور شیریں بیانیوں میں بہ جانے کے بڑے خطرے ہیں۔"

آدمی تعجب کرتا ہے کہ کیا یہ سنجیدہ اور دیندار اُندلسی بھی کسی شوخ نظر بغدادی حسینہ کے تیرِ ابرو سے گھائل ہوا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس پیرائے میں بغداد کی عورتوں کا ذکر کرتا۔ وہ یقیناً دل میں ایک 'رومینٹک' تھا، اور اپنی متانت اور علمیت کے بوجھل پن کے باوجود ایک گوشت پوست کا عام انسان!

بغداد میں ان کے دن حسبِ معمول مذہبی مناظروں اور مجالس میں شرکت۔ اور وہاں کی مشہور عمارتوں کی سیر میں گزرے۔ اپنے فارغ وقت میں وہ اپنے وقائع لکھتا یا اپنی حفظ شدہ قرآنی آیات کو دوبارہ یاد کرتا تھا کہ کہیں وہ اُنھیں بھُول نہ جائے۔ ہوش مند اور قابلِ تعریف ابنِ جُبیر!

لیکن اگر وہ کبھی اپنے دل کو پاسبانِ عقل کی نگرانی سے رہا کر کے تنہا چھوڑ سکتا تو اس کے وقائع کس قدر پُرمسرّت ہوتے!

بغداد — امن کا شہر

"بغداد ایک قدیم شہر ہے۔ اور گو یہ اب تک عباسی خلافت کی راجدھانی اور قریشی و ہاشمی اماموں کے مناظروں کا مرکز رہا ہے۔ اس کی آن بان کے اکثر نقوش مٹ چکے ہیں۔ صرف بغداد کے نام کا شہرہ رہ گیا ہے۔ باقی کچھ نہیں۔ اپنی پہلی حالت کے مقابلے میں جب کہ سیاہ بختی نے اسے نہیں مارا تھا۔ اور بپتا کی آنکھ نے اسے گھُور کے نہیں دیکھا

تھا اب یہ ایک منہدم شدہ کھنڈر ہے، ایک خیالی وجود یا ایک بھُوت کی صورت ہے۔ اس میں ایسی کوئی خُوبی اور دلرُبائی نہیں جو دل کو کھینچ لے یا اس کو جو جانے کے لیے بے تاب ہو ٹھہرنے اور نظارہ کرنے کی دعوت دے۔ ماسوا فرات کے جو اس کے شرقی اور غربی حصّوں کے بیچوں بیچ چوکھٹے میں جڑے آئینے یا دو چھاتیوں کے درمیان موتیوں کی لڑی کی مانند بہتا ہے۔ شہر اس کا مصفّا ٹھنڈا پانی پیتا ہے۔ اور پیاسا نہیں رہتا اور اپنی شکل ایک ایسے صاف شیشے میں دیکھتا ہے جو دھندلاتا نہیں اور اس کی عورتوں کی خوبصُورتی....

جہاں تک اس کے باشندوں کا تعلق ہے تم کو ایسا آدمی ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا جو بظاہر انکسار اور مروّت نہ برتتا ہو لیکن اصل میں وہ شیخی خورا اور پُر نخوت نکلے گا۔ اجنبیوں اور پردیسیوں سے وہ حقارت کرتے ہیں اور اپنے سے کم حیثیت والوں سے نفرت اور ذلّت کا سلوک کرتے ہیں۔ دوسروں کی کہانیوں اور خبروں کو وہ استہزا میں اُڑاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ ساری دُنیا اس کے دیس کے مقابلے میں ہیچ ہے اور روئے زمین پر اُنھیں اپنے شہر کے سوا کوئی اور رہنے کے لائق جگہ نظر نہیں آتی۔ خدا نے گویا ان کے دماغ میں یہ خیال ڈال دیا ہے کہ ان کے دیس اور لوگوں کے علاوہ دُنیا میں اور مُلک یا لوگ نہیں بستے۔ وہ اپنے لمبے فرغل کے دامن کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے بڑے بانکپنے اور نزاکت سے اترا کر چلتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح فرغل گھسیٹ کر چلنے میں ان کی بڑی شان ہے اور یہ نہیں جانتے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہ حدیث کی رُو سے ان کا 'ذرغل مشعلوں کی نذر کیا جائے گا'۔ اپنا لین دین وہ اُدھار لیے سونے سے کرتے ہیں لیکن خدا کو قرض نہیں دیتے۔ (یعنی خیرات نہیں کرتے)۔ سوائے دیناروں کے کوئی سکہ قبول نہیں کرتے۔ نہ ہی ان میں کوئی ایسا ہے جو تول میں پورا ہو۔ تم اس کے باشندوں کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کبھی کھری صداقت سے پورے نہ اُتر سکو گے اور اس کے تولنے والوں اور ماپنے والوں میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا جس پر قرآن پاک کی اس آیت کا اطلاق نہ ہوتا ہو کہ "کم تولنے والوں کے لیے ہلاکت ہی ہلاکت ہے"۔ وہ اس بات میں ذرّہ بھر بھی شرم محسوس نہیں کرتے گویا کہ وہ شعیب نبی کی اُمت کے بچے کھچے مدائنی ہوں جنھوں نے شعیب نبی کی تنبیہہ کو کہ وہ ناپ تول میں کسر نہ کریں اور خدا کے سوا کسی اور معبود کی پرستش نہ کریں ہنس کر رد کر دیا تھا"۔

خدا نے شعیب کی اُمت پر بھونچال کی شکل میں عذاب نازل کیا۔ ان کے شہر مٹی میں مل گئے اور وہ تباہ کر دیے گئے۔ یہی حال اِن بغداد کے لوگوں کا چنگیز خاں کے نواسے کے ہاتھوں ہُوا۔

"ان کے درمیان پردیسی بے یار و مددگار اور بے رفیق رہتا ہے۔ اس کے اخراجات دوگنے ہو جاتے ہیں اور ان میں اسے کوئی بھی ایسا نہیں ملتا جس کا شعار فریب دہی نہ ہو یا جو کسی فائدے یا نفع کی خاطر اس سے رنگ رلیاں منانے پر آمادہ نہ ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس جھوٹ مُوٹ کی دوستی اور ظاہرداری پر اس لیے مجبور ہیں کہ زندگی کا مزہ بھی لُوٹ لیں اور سودے میں بھی کسر نہ کھائیں۔ اس شہر

کے لوگوں کی یہ بداطواری اس کے ہوا اور پانی پر غالب آ کر اس کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ اور اسی سے اس شہر کے متعلق خوشنما قصوں اور فرضی روایتوں کے مشہور ہونے کی اصلی وجہ معلوم ہوتی ہے"۔

کیا یہ آج کل بھی کئی شہروں اور ان کے کاروباری لوگوں کا حال نہیں ہے؟ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ جُبیر بغداد کے بانکے منچلے شہریوں پر کچھ زیادہ ہی سخت اور غضب ناک ہے تم جانتے ہو کہ وہ لوگوں کو صرف باہر سے دیکھتا ہے اور ان کے سینوں کے اندر جھانکنے کی زیادہ کوشش نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کی اندرونی کیفیاتِ حیات اور محرکات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی اسے انسانوں کی کوئی وجدانی سمجھ ہے۔ اس کے لیے انسان کالے ہیں یا سفید، بُرے ہیں یا اچھے، جب خود احمد بن حسین غرناطہ کا طبیب اور اس کا ہم وطن اس کے وقائع میں محض ایک نام رہتا ہے تو اس کے لیے بغداد یا کسی اور ملک کے لوگوں کو داخلی طور پر سمجھنا کتنا مشکل ہے اور وہ ایک دوسرے موقعے پر آنکھ جھپکے بغیر اپنی پہلی رائے بھی بدل سکتا ہے۔ وہ لوگ جو فطرتاً لا اُبالی اور ہنس مُکھ تھے سارے کے سارے بے ایمان اور بدمعاش نہیں ہو سکتے۔ اور کیا خود ابنِ جبیر غرناطہ کا باشندہ ہونے پر نازاں نہ تھا۔ بغداد کے لوگوں کو کیوں بغداد کے شہری ہونے پر فخر نہ ہوتا۔

مجھے شک ہے کہ بغداد میں ابنِ جُبیر اور احمد بن حسین کچھ خریدنے نکلے ہوں گے اور دکاندار نے اُنھیں اجنبی دیکھ کر کم تول دے دیا ہوگا اور پھر دیناروں کے علاوہ جو خلافت میں مروّجہ سکّہ تھا۔ کوئی اور مبادلہ لینے سے انکار کر دیا ہوگا۔ اسی قسم کی چیز ایک چینی کے ساتھ کراچی میں پیش آ سکتی ہے اگر وہ چینی فرانکوں سے کچھ خریدنے کی کوشش کرے۔ دونوں دوست سخت غصّے اور برہمی میں اپنی قیام گاہ کو لوٹے ہوں گے اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

ابنِ جُبیر نے اپنے اس روز کے وقائع میں اپنے دل کا بخار نکالا ہوگا۔

"میں سب اہلِ بغداد کے لیے خدا کی معافی کا خواستگار ہوں ماسوا اُن کے محدث فقیہوں، اور نصیحت کرنے والے واعظوں کے، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے وعظ و ذکر کے طریقے میں، ہدایت اور تفہیم میں، خوفناک تنبیہوں اور دھمکیوں میں وہ خدا کی رحمت کے مستحق اور اُمیدوار ہیں جو ان بغدادیوں کے بہت سے گناہوں کا بوجھ ہلکا کردے گی۔ ان کے گھروں پر شدید ترین آفات کے نزول سے اُنھیں بچائے گی۔ لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ یہ فقیہہ گویا ٹھنڈے فولاد کو کوٹ رہے ہیں۔ اور پتھروں سے پانی نچوڑنے کی سعیٔ لاحاصل کرتے ہیں۔ کوئی جمعہ ایسا نہیں جاتا کہ ان فصیح واعظوں میں سے ایک اُنھیں خطاب نہ کرتا ہو۔ اور ان میں سب سے کامیاب واعظ ہر وقت ذکر کی مجلسوں میں رہتا ہے۔"

گو خدا اہلِ بغداد کو ان کے کم تولنے پر معاف کردے گا مگر ابنِ جُبیر اُنھیں معاف کرنے پر تیار نہیں ہے۔ بغداد کے لوگوں سے مایوس ہوکر اُس نے وہاں فقیہوں اور مبلّغوں کی مجالس میں باقاعدہ شرکت کرنے کو خود پر فرض کرلیا۔ کچھ تو اپنی دیندارانہ اُفتاد سے اور کچھ گناہ کے خیالات سے بچنے کے لیے، کیونکہ بغداد کی ورغلاہٹیں بہت سی تھیں۔ احمد ابن حسین ہمیشہ اس کے ساتھ میں ہوتا۔ جیسا کہ 'ہم' کے استعمال سے ظاہر ہے۔ میں تصور کرتا ہوں کہ طبیب ایک گول مٹول۔ خوش مزاج متموّل غرناطوی ہوگا۔ طبیب ہونے کی وجہ سے وہ اپنے دوست سے کہیں زیادہ انسانی فطرت۔ اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں اور تضاد کو سمجھتا ہوگا۔ وہ اپنے دوست سے محبّت بھی کرتا تھا ــ اور میرا خیال ہے اس سے کچھ ڈرتا بھی ہوگا۔ ابنِ جُبیر ہمیشہ اس کاہل شخص کو (جو حرم شریف

میں سوگیا تھا اور جیسا کہ اس واقعے سے پتا چلتا ہے کچھ جھکیلا اور ڈرپوک تھا) کھینچ کر ان مجالس میں لے جاتا ہوگا اور جب نشست بہت زیادہ طویل ہوجاتی ہوگی۔ تو وہ اپنے کھڑے زانوں پر سر رکھ کر اُونگھنے لگتا ہوگا۔ اگر احمد بن حسین اکیلا ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے وہ کیا گُل نہ کھلاتا۔ ممکن ہے وہ یہاں تیرہ دن کی بجائے تیرہ ہفتے یا تیرہ مہینے پڑا رہ جاتا۔ الکرخ یا العتابیہ میں جہاں ریشم اور سوت کا کپڑا بنانے والے رہتے تھے۔ وہ ایک طبابت کی دوکان کھول لیتا جس کے اُوپر تختی پر لکھا ہوتا:

احمد ابن حسین اُندلسی

غرناطہ کا مشہور طبیب و جراح

اور ایک دن اس دوکان پر ریشمی نقاب پہنے اور ایک حبشی قلماقنی ساتھ لیے ایک دوشیزہ آتی ــــ اور الف لیلہ کی ایک اور داستان کا آغاز ہوتا۔ اس زمانے میں مسافر اور زائر کے لیے گھر اور وطن دیر سے پہنچنے کے کئی بہانے ہوسکتے تھے اور برسوں کی غیرحاضری کا بڑی آسانی سے عذر پیش کیا جاسکتا تھا جو نہ صرف سننے والوں کی ہمدردی حاصل کرتا بلکہ مسافر کی بیوی کو بھی کلی طور پر مطمئن کردیتا۔ احمد ابن حسین کو اس معاملے میں کوئی تکلیف پیش نہ آتی۔ باقی رہا غرناطہ میں اس کی دکان کا مسئلہ۔ تو یقیناً احمد ابن حسین حج پر جانے سے پہلے وہاں اپنے بڑے بیٹے یا نائب کو بٹھا کر آیا ہوگا۔ اور اس کے گھر والے مزے اور چین سے رہتے ہوں گے۔

خیر یہ تو سب قیاس آرائی ہے...... اور یہ اس لیے کہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ احمد ابن حسین محض ایک نام ہی رہے۔

اُنھوں نے "شیخ و امام رضی الدین القزوینی۔ شافعیوں کے امیر اور نظامیہ کالج میں دینیات کے پروفیسر" کا لکچر جمعہ کے روز سُنا۔ شیخ جو ارکانِ دین کا ماہر تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد منبر پر چڑھا اور عصر کے وقت نیچے اُترا۔ اُس نے ایک پُرسکون اور سنجیدہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

تقریر کی - اور صدر الدین کی طرح اس نے بھی کئی لٹیں قینچی سے قطع کیں - لٹ کاٹنے کا مطلب یہ تھا کہ دلوں کے شکوک کٹ گئے اور رفع ہو گئے -

اُنھوں نے اگلے جمعے شام کو نظامیہ کالج میں اُس کے ایک اور لکچر میں شرکت کی جس میں خراسان کے حکما کا اُستاد، شافعی اماموں کا امیر صدر الدین الخدنجی بھی موجود تھا - اور دوسرے ہی دن وہ شیخ فقیہہ اور امام، واحد اور یکتا جمال الدین ابو الفضائل ابن علی الجوزی کا لکچر سُننے جا پہنچے جو اُس نے دریا کے مشرقی کنارے پر اپنے گھر کے پاس دیا -

"اس گھر کی حد سے ملحق خلیفہ کے محلات ہیں اور یہ گھر باب البصلیۃ کے قریب ہے - یہاں یہ شیخ ہر سنیچر کو لکچر دیتا ہے - ہم جس شخص کے وعظ پر حاضر تھے وہ کوئی عمر یا زید نہیں تھا "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" کے مصداق وہ سب زمانے کی محیر العقول ہستی ہے اور دین کی محترم درگاہ - وہ حنبلیوں کا امام ہے، اعلیٰ ترین درجہ کی علمیّت میں ماہرِ خصوصی، مسجد کا امام، اور اپنے پیشے کا محکم شاہسوار - وہ فصاحت اور علمیّت کی شاندار فتوحات کے لیے مشہور ہے اور شعر اور مقفیٰ و مرصّع نثر کی باگ ڈور خوش اسلوبی سے تھامے ہوئے ہے اُس نے فکر کے سمندر میں گہرے غوطے لگائے ہیں اور تہ سے آبدار موتی نکال کے لایا ہے - اس کی شاعری مزاج میں رقّتی جیسی ہے لیکن تہیار کے طرز پر ہے اور اس کی مرصّع نثر میں تو قسّ اور سحبان بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتے "

جمعرات کی صبح کو وہ اس کے ایک اور لکچر میں گئے - اس دفعہ جلسہ گاہ خلیفہ کے محلات کا اسکوئر (SQUARE) تھی - بالائی جھلملیوں کے نیچے -

"اسکویر خلیفہ کے حرم میں ہے اور واعظوں کے لیے جو وہاں وعظ

کرنے آتے ہیں مخصوص ہے - خلیفہ اس کی والدہ اور اس کے حرم کی عورتیں جھلملیوں کے پیچھے بیٹھ کر سُنتی ہیں ——— اپنے خطاب میں اُس نے آتش برپا کر دینے والی کئی عشقیہ غزلیں پڑھیں یہاں تک کہ دل جذبات کی آگ سے بھڑک اُٹھے اور نفسانیت سے راہبانیت کی طرف لوٹ گئے جب اس کے سُننے والے اس کی بلاغت کے تیروں کے سامنے نیم جان ہو چکے تو آخری چیز اُس نے یہ پڑھی :

میرا دل جسے عشق نے پگھلا دیا ہے - کہاں ہے ؟
میرا دل جو ابھی تک ہوش میں نہیں آیا - کہاں ہے ؟
او سعد! ان کی یادوں سے میری محبت کو گرم نفس کر دے !
او سعد ! تجھے اللہ کا واسطہ، کچھ تو بول !

بار بار رُکے بغیر وہ یہ شعر پڑھتا، جذبات کی شدّت سے مغلوب آنسوؤں نے اُس کی زبان روک رکھی تھی کہ بمشکل اس سے کوئی لفظ نکلتا تھا - یہاں تک کہ ہم ڈرنے لگے کہ کہیں اس کا دَم نہ گھٹ جائے - وہ منبر سے جلدی سے اُترا اور ایک طرف چل پڑا - لوگ سُرخ آنکھوں سے اس کا پیچھا کرتے تھے اور روتے تھے اور خاک میں لوٹتے تھے - اوہ کیا منظر تھا وہ !"

فوراً اس کے بعد ابنِ جُبیر اور احمد ابن حسین ایک اور مجلس میں جا پہنچے -

"ہم مغرب کے واعظوں کے مقابلے میں ان واعظوں کی عمدگی اور سحر گوئی پر متعجب تھے - مکہ اور مدینہ میں بھی ہم نے ان کے وعظ سُنے تھے جن کا ہم نے ان وقائع میں ذکر کیا ہے لیکن وہ اس بے مثال شخص کے سامنے ہر لحاظ سے ہیچ تھے "

toobaa-elibrary.blogspot.com

سنیچر کو وہ پھر اس کے لکچر میں تھے۔

"اس بار بھی وعظ کے خاتمہ پر اس نے چند جلتے ہوئے عشقیہ شعر پڑھے پُرحدّت صوفیانہ اور جذباتی! آخر کمزوری اس پر غالب ہوگئی اور وہ منبر پر سے چھلانگ لگا کر نیچے اُترا۔ غمزدہ اور مجبور۔ رونے والے اُس کے گرد چکّی کے پاٹ کی طرح گھومنے لگے۔"

جمال الدین ان واعظوں میں سے تھا جو صوفیوں کے طریق پر عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ اس کے وعظ میں جذبات انگیز عشقیہ شاعری عجمی تاثرات کے تابع تھی لیکن اس کی جڑیں انسانی سرشت میں دُور نیچے تک گئی ہوتی تھیں۔ اگر اُس سخت مزاج اور سچائی سے جھوٹ کو الگ کرنے والے خلیفہ عمر بن الخطاب کے روبرو کوئی ایسا سحر بیان واعظ ایسی تقریر کرتا تو آدمی سوچتا ہے کہ اُس کا ردِّ عمل کیا ہوتا۔ غالباً وہ اسے کوڑے لگواتا۔

"اور اب ہم" جیسا کہ ابنِ جُبیر لکھتا ہے "بغداد کے احوال کو واپس آتے ہیں"۔ لیکن بغداد کا احوال طویل ہے اور ہم صرف اس شہر کی چند جھلکیاں ہی دے سکتے ہیں۔ شہر کے دو حصّے تھے۔ غربی حصّہ اور شرقی حصّہ جیسا کہ الف لیلہ کے بغداد کے تھے۔ دجلہ ان کے درمیان بہتا تھا۔ غربی حصّہ جہاں تباہی سے پہلے بڑی گھنی آبادی تھی اب برباد اور اُجاڑ ہوچکا تھا۔ اس تباہی کے باوجود غربی حصّے میں اب بھی سترہ محلّے تھے کہ ان میں ہر ایک اپنی جگہ پر اچھا خاصہ شہر تھا۔ ہر ایک محلّہ میں دو تین حمام تھے اور ان میں سے آٹھ میں جامع مسجدیں تھیں۔

"ان محلّوں میں سب سے بڑا محلّہ القریہ ہے۔ جہاں ہم المربّعہ Square

کی ایک سرائے میں ٹھہرے۔ یہ سرائے پُل کے پاس ہی لبِ دریا تھی طغیانی میں یہ پُل بہہ چکا تھا۔ اور اب لوگ کشتیوں سے آرپار آتے جاتے تھے۔ یہ کشتیاں لاتعداد ہیں۔ اور لوگ جو دن رات بغرضِ سیر و تفریح دریا کو عبور کرتے ہیں وہ بھی لاتعداد ہیں۔ عام طور پر لوگ دوسرے دو پُلوں پر سے گزرتے جب تفریح ان کا مقصد نہ ہوتا۔ دوسرے محلّوں کے نام الکرخ۔ باب البصرہ۔ الشارع سوق المارستان (ہسپتال بازار) وغیرہ تھے۔ سوق المارستان اپنے آپ میں ایک چھوٹا سا شہر ہے اور اس میں مشہور بغداد ہسپتال ہے۔ یہ دجلہ پر ہے اور ہر سوموار اور جمعرات کو اطباء اور جراح بیماروں کی حالت کا معائنہ کرنے اور اُنھیں دوا تجویز کرنے کے لیے آتے ہیں۔ ان کے تلے وہ اشخاص ہوتے ہیں جو ان کی ہدایات کے مطابق مریضوں کے لیے پرہیزی کھانے اور دوائیں تیار کرتے ہیں۔ ہسپتال ایک بہت بڑے محل کی مانند ہے۔ جس میں حجرے اور کمرے ہیں۔ شاہی ٹھاٹھ باٹھ سے آراستہ۔ اس میں پانی ایک نل کے ذریعے دجلہ سے آتا ہے۔ العتابیہ کے محلّے میں زنگارنگ کے ریشمی اور سوتی کپڑا بنانے والے بیٹھتے ہیں۔ بغداد میں بہت سے اولیائے کرام اور نیک آدمیوں کے مقابر اور روضے ہیں۔ امام ابوحنیفہ۔ امام احمد بن حنبل اور ابوبکر شبلی کے مزار شہر کے شرقی حصّے میں باب الطاق میں ہیں۔

شہر کے غربی حصّے میں تاک اور چار دیواری میں محصور باغات ہیں جن میں سے پھل مشرقی حصّے میں لایا جاتا ہے۔ یہ آج کل خلیفہ کا گھر ہے اور اس کے لیے یہ عزّت کافی ہے۔ خلیفہ کے محل مشرقی شہر کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

سرے پر ایک پُورے محلّے کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں کیونکہ سب عباسی انہی محلات کے پُرتکلّف عیش و خلوت میں رہتے ہیں - ان کے وظائف مقرر ہیں وہ شاذ ہی باہر دیکھے جاتے ہیں - ان محلّات کا ایک بڑا حصّہ خلیفہ کے تصرّف میں ہے جس میں شاندار ایوان اور پُربہار باغ ہیں - آج کل اس کا وزیر کوئی نہیں ہے - ایک عہدیدار جو نائب وزیر کہلاتا ہے خلیفہ کی ذاتی جائداد کا انتظام کرتا ہے اور حساب کی کتابیں اس کی تحویل میں ہوتی ہیں - اس کے عہد کی آن بان اب صرف خوش پوشاک خادم لڑکوں اور حبشی خواجہ سراؤں میں رہ گئی ہے جن میں خالص نامی ایک نوجوان ساری فوج کا کمانڈر انچیف ہے - ہم نے ایک بار اس خالص کو گزرتے دیکھا - اس کے آگے اور پیچھے راہواروں پر فوج کے ترکی اور عجمی افسر تھے اور پچاس آدمی سونتی ہوئی ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے ان کو گھیرے تھے - اس کی قدر و قیمت کی بابت ہم نے عجیب و غریب باتیں اس زمانے میں سُنیں - دجلہ پر اس کے اپنے محلات اور جھروکے ہیں - خلیفہ کبھی کبھار اس کی ہم جلیسی میں، بجرے پر دریا کی سیر کرتا ہے اور بعض وقت وہ صحرا میں شکار کی خاطر جاتا ہے - لوگوں سے اپنی حالت اور امارت پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ بظاہر معمولی حیثیت میں باہر نکلتا ہے"

اور ایک دن اُنھوں نے خلیفہ کو بھی دیکھا - خلیفہ کا نام تھا - ابوالعباس احمد الناصر لدین اللہ ابن المستضئ بنور اللہ ابو محمد الحسن ابن المستنجد باللہ ابوالمظفر یوسف - وہ غربی حصّے میں قصر سے بجرے میں اُترا اور دریا میں سے مشرقی کنارے کے قصر کی طرف گیا -

" وہ ابھی ایک نوجوان ہی ہے - ملیح ، ڈاڑھی مختصر مگر پُوری ، خوش اندام اور دیکھنے میں خوبصورت، درمیانہ قد اور جامہ زیب ! وہ تقریباً پچیس برس کا ہے - وہ ایک زرتار سفید پوشاک پہنے تھے اور اس کے سر پر ایک زرّیں کلاہ تھا جس کے گرد قیمتی سیاہ سمور کی پٹی تھی - اس ترکی لباس کے پہننے سے اس کا مطلب خود کو چھپانا تھا - لیکن سُورج نقاب میں بھی پہچانا جاتا ہے - ہم نے اس کو اس سے اگلے دن بھی دیکھا کیونکہ ہماری سرائے مغربی کنارے پر اس کے قصر کے نزدیک ہی تھی "

ابنِ جبیر شہر کے حماموں کو نہ گن سکا (کیونکہ اس میں بڑا وقت لگتا) لیکن ایک محترم شیخ نے اُنھیں بتایا کہ شرقی اور غربی حصّوں میں ملا کر کل دو ہزار حمام ہیں - شیخ نے بھی غالباً ان کو نہیں گنا تھا اور بغداد کے شیخ بھی ضرور لاف زن اور ناقابلِ اعتبار ہونگے - میرا اپنا خیال ہے کہ دو سو حمام تو ضرور ہوں گے - ان میں سے بیشتر بٹومن Bitumen سے لپے تھے اور دیکھنے والا سمجھتا کہ وہ سیاہ چمکدار مرمر کے بنے ہوئے ہیں - عام مساجد کا شمار نہیں تھا، کالج جو سب کے سب شرقی حصّے میں تھے تیس کے قریب تھے اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو عمدہ ترین محل سے کسی طور کم ہو - ان میں سب سے بڑا اور مشہور نظامیہ تھا جسے نظام الملک نے ۵۰۴ ہجری میں تعمیر کرایا تھا - ان کالجوں کو چلانے کے لیے بڑی جائدادیں وقف تھیں جن کے محاصل سے پڑھانے والے فقیہوں کی تنخواہیں اور طالب علموں کے وظائف پورے کیے جاتے تھے - اس زمانہ میں بغداد میں تعلیم مفت تھی — "مختصراً" ابنِ جبیر اب اقرار کرتا ہے -

" اس شہر کی شوکت ایسی ہے کہ الفاظ اسے بیان نہیں کر سکتے - لیکن آہ ! افسوس ! جو کچھ وہ تھا - اس کے مقابلے میں اب بغداد کیا ہے ؟ آج ہم اس پر عاشق کی اس فریاد کا اطلاق کر سکتے ہیں -

toobaa-elibrary.blogspot.com

تُو اب تو نہیں ہے
اور کُوچے وہ نہیں ہیں جنھیں میں جانتا تھا "

تیرہ دن بغداد میں قیام کرنے کے بعد وہ سوموار پندرہ صفر اٹھائیس مئی کو موصل کے لیے روانہ ہوئے اور اُنھوں نے ہمیشہ کے لیے اس الف لیلہ کے شہر سے پیٹھ پھیر لی، جو کبھی شہروں کی دُولھن تھا۔ اور اپنی اس اُجڑی حالت میں بھی دُنیا کے شہروں میں ممتاز تھا ۔

بغداد سے دمشق

الف لیلہ اب بھی اُن کے ساتھ تھی !

امیر مسعود کی لاڈو شہزادی ناگہانی ان کی شامِ روانگی کے سمے اپنے خدم وحشم اور پوری آن بان کے ساتھ آ وارد ہوئی۔ دو مُطلّا ڈانڈوں پر کہ آگے اور پیچھے حیوانوں پر کَسے تھے۔ شاہزادی کی گنبد نما پالکی دھری تھی جس میں وہ خَلوت نشین تھی۔ حیوان۔ غالباً گدھے ۔ زریں جھالروں سے سجے تھے اور اپنے اُوپر لدے ہوئے اس "حُسنِ شامی" کو بادِ نسیم کی سی سبک خرامی کے ساتھ لے کر چلتے تھے۔ پالکی کے سامنے اور پیچھے دریچے تھے اور شاہزادی اُن میں سے چہرے پر نقاب ڈالے اور سونے کا نیم تاج پہنے نظر آتی تھی۔ اس کے آگے آگے سنہرے راہواروں پر ہتھیار باندھے اس کے جانباز اور سپاہی تھے۔ اس کے دائیں طرف گھوڑے اور عمدہ کرائے کے ٹٹو تھے اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی ہمجولیوں اور خواصوں کی ٹولی ٹٹوؤں پر زرکار زینوں میں سوار ابرِ بہار کی سی نرم رفتاری کے ساتھ چلی آتی تھی۔ شاہزادی کی یہ باندیاں بھی زریں نیم تاج پہنے تھیں جن کے طُرّے ہوا میں لہراتے تھے۔ وہ اپنی مالکن کے جلو میں پھریرے۔ ڈھولکیاں اور نفیریاں لیے سفر کر رہی تھیں جنھیں وہ اس وقت بجاتیں جب اُن کی مالکن پالکی میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

سے اُترتی یا سوار ہوتی ۔

شاہزادی کی سواری کی آمد پر قافلے میں ایک دھڑکن سی جاگ اُٹھی اور سب کے دل دھکنے لگے ۔ کیونکہ اُس پُر نخوت اور حسین مسعودی شاہزادی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ اُس کے آنے سے جیسے بہار کی تازہ ہوائیں چلنے لگتیں اور لوگوں کی تھکن اور درماندگی ڈھل جاتی ۔ جب ابنِ جُبیر شہزادی کا ذکر کرتا ہے تو وہ بھی ایک سنجیدہ، پُرسکون وقائع نگار کی بجائے جوانی کی بہار میں بسا ہوا ایک البیلا نوجوان لگتا ہے ۔ اور احمد بن حسّان طبیب کے جلد متاثر ہونے والے حُسن پرست دل پر تو اس قیامت خیز حُسن کا اثر تباہ کُن ہوتا ہوگا ۔ رات کو اُسے تارے گننے کی زحمت سے بچنے کے لیے اپنی ایجاد کردہ خواب آور خوراک کی مدد لینی پڑتی ہوگی ۔ اور خیمے میں بیٹھے وہ بیشتر وقت شاہزادی کی باتیں کرتے ہوں گے ۔ ابنِ جُبیر اپنی گھٹی کی متانت اور احتیاط کے سبب ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ آیا اُس نے شاہزادی کی حسین صورت بھی کبھی دیکھی ؟ اور اگر دیکھی تو اس کے دماغ میں کیا کیا خیال آئے ؟ کیا اُس نے قرآن اور حدیث کی رُو سے نامحرم پر نظر پڑتے ہی آنکھیں نیچی کرلیں اور خدا سے دُعا مانگی کہ وہ اُسے شیطان کے وسوسوں اور بہکاووں سے نجات دے ؟

اگر وہ عمر میں کئی برس چھوٹے بھی ہوتے، اور اُن کے خُون میں جوانی کی آگ ہوتی، تو بھی دو پردیسی حاجی اتنی پُرتجمل اور شاندار شاہزادی کی نظر میں کیوں کر سما سکتے ؟ اور اس کے دل میں کیسے گھر کر سکتے ؟ ——— اور پھر یہ شاہزادی تو افسانوں کی شہزادی تھی، خوابوں میں بسانے کے لائق، نہ کہ حاصل کرنے کے لیے !

یہ شاہزادی اس لشکر کی امیر اور سپہ سالار تھی جو قافلے کی حفاظت کے لیے ساتھ تھا اور ادھیڑ عمر کا ابنِ جُبیر قدرے شرارت کے ساتھ اور زہر خند انداز سے کہتا ہے :

"خُدا نہ کرے کہیں ہم پر وہ کہاوت صادق آئے کہ لشکر اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ تباہ ہوگئے ۔"

اُندلس میں میدانِ جنگ کے اندر یا فوج میں عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی ۔ ان کا مقام گھر میں تھا ۔ اور ان کا کام تھکے ہوئے جسموں کو راحت اور گرمی پہنچانا تھا ۔ ایک فوج کا یہ طرحدار بانکا سپہ سالار ابنِ جُبیر کی نظروں میں کچھ جچا نہیں ۔

اس قافلے میں شام، موصل اور درب سے ملحقہ عجمی ممالک کے حاجی تھے جو سب اس مسعودی شاہزادی کے باپ کی رعایا تھے ۔ ابنِ جُبیر اور احمد بن حسّان ہی دو مغربی غیر ملکی اس قافلہ میں تھے ۔

"امیر مسعود کی قلم رو میں آدمی چار ماہ سفر میں رہے تب کہیں اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا ہے ۔ قسطنطنیہ کا فرمانروا اُسے خراج ادا کرتا ہے ۔ وہ اپنی رعایا پر انصاف سے حکومت کرتا ہے اور نصرانی صلیبوں کے خلاف اس طور سے مسلسل جہاد کرتا ہے کہ بے حد قابلِ تعریف ہے ۔ ایک محترم شیخ نے ہمیں بتایا کہ سالِ حال میں اُس نے پچیس بازنطینی شہروں کو زیرنگیں کیا ہے ۔"

موصل کے راستے پر آبادیاں بکثرت تھیں اور یہ سارا شاداب اور زرخیز خطہ تھا ۔ الحربہ میں ٹھہرتے اور سُرّ من رأی (جو اسے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے) کے پاس سے گزرتے جمعہ اُنیس صفر یکم جون کو تکریت میں پہنچے ۔

"تکریت ایک بڑا شہر ہے ۔ عمدہ بازار، اور بہت سی مساجد ۔ اس میں بہت سے لوگ بستے ہیں جو بغداد کے لوگوں سے بہتر اخلاق کے ہیں ۔ اور اُن سے تول میں اچھے ہیں ۔"

وہ دجلہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے کئی شہروں اور بستیوں میں سے گزرے ۔ القیارہ میں اُنھوں نے چھوٹے بڑے کئی کنوئیں یا چشمے دیکھے ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

"جن میں سے خدا بٹومن Bitumen اُچھالتا ہے۔ بعض میں سے جھاگ اُٹھتی بھتی جیسے کہ وہ اُبل رہے ہوں۔ وہاں کے لوگ اُسے بڑے بڑے کونڈوں میں جمع کرتے ہیں اور تم اسے چکنی مٹی کی طرح پھیلا ہوا دیکھ سکتے ہو۔ سیاہ چمکدار اور نرم۔ یہ بڑا لیس دار ہوتا ہے۔ اور فوراً اُنگلیوں سے چمٹتا ہے۔ یہ بٹومن شام، عکہ اور تمام ساحلی خطّوں تک پایا جاتا ہے۔"

دن چڑھ چکا تھا کہ وہ موصل میں داخل ہوئے۔ وہ اس کے اطراف میں لبِ دریا کی سراؤں میں سے ایک سرائے میں اُترے منگل کا روز تھا۔ اور ماہ صفر کی تیئیس تاریخ مسعودی شاہزادی اور الف لیلہ غائب ہو گئے!

"موصل ایک بڑا اور قدیم شہر ہے۔ قلعہ بند اور محکم۔ اور زمانہ کے حوادث اور فتنوں کے خلاف ہر وقت نبرد آزما! اس کی فصیل کے بُرج اتنے ساتھ ساتھ بنائے گئے ہیں کہ ایک بُرج دُوسرے کو تقریباً چھُوتا ہے۔ ان میں اُوپر نیچے کمرے اور حجرے ہیں جو فصیل کے گرداگرد جاتے ہیں۔ سُورماؤں کے لیے یہ حجرے ایک محفوظ پناہ کا کام دیتے ہیں۔ شہر کی ایک اُونچائی پر ایک بڑا احصار ہے کہ اس کے پتھر مضبوطی سے پیوستہ ہیں اور اُونچے بُرجوں کی کہنہ دیواریں اس کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اس سے ملحقہ سلطان کے قصر ہیں۔ ان کے اور شہر کے درمیان ایک چوڑی سڑک ہے جو چوٹی سے اُتر کر دریا کے کنارے تک آتی ہے۔ دجلہ شہر کی شرقی جانب سے ان کہنہ دیواروں کو چھُوتا ہُوا گزرتا ہے۔ اور بُرج پانی پر بہتے ہوئے لگتے ہیں۔ شہر کے مضافات دُور دُور تک پھیلے ہیں اور ان میں مساجد، حمام، سرائیں

اور بازار ہیں۔"

حماموں کی کُل تعداد اُنھیں معلوم نہ ہو سکی۔ کیونکہ اُنھیں موصل میں کوئی ایسا حساب دان اور قابلِ اعتبار شیخ نہ ملا جیسا کہ اُنھیں بغداد میں ملا تھا۔ وہ دجلہ کے کنارے امیر مجاہدالدین کی تعمیر کردہ جامع مسجد کو بھی دیکھنے گئے (اور وہ اسے دیکھے بغیر کیسے رُہ سکتے تھے)

"میں نے ایسی عظیم الشان جامع مسجد کہیں نہیں دیکھی۔ اس کی معمارانہ آرائش کو بیان کرنا لاحاصل ہے۔ سرتاسر یہ پُر رنگ منبت کاری سے ڈھنپی ہُوئی ہے اور اس کا مقصورہ دیکھ کر جنت کا خیال آتا ہے۔ ہر طرف آہنی جالی دار دریچے ہیں جن کے نیچے بنچ رکھے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر آدمی دجلہ کے حسین منظر کی سیر کر سکتا ہے۔ اس کے سامنے امیر مجاہدالدین کا بنایا ہوا عمدہ ہسپتال ہے۔ اس نے شہر کے اندر بازار میں سوداگروں کے لیے ایک قیساریہ بھی بنایا ہے جو ایک بڑی سرائے کی مانند ہے۔ یہ قیساریہ آہنی دروازوں سے بند ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اردگرد اُوپر نیچے دوکانیں اور گھر ہیں۔ یہ حسین نقش و نگار سے مزین ہے۔ اور ایک بے مثال تعمیری نزاکت کا حامل۔ میں نے کسی مُلک میں ایسا قیساریہ نہیں دیکھا۔ شہر میں علم کے حصول کی خاطر سات کالج ہیں۔"

وہ جرجیس نبی کے مزار پر بھی گئے جو عیسائیوں کا سینٹ جارج ہے اور ایک دن اُنھوں نے توبہ کی پہاڑی پر بھی گزارا۔ اس پہاڑی پر یونس نبی اور اس کی اُمت کئی دن کھڑے دُعا مانگتے رہے حتیٰ کہ خدا نے ان پر اپنی رحمت بھیجی۔ عمارت کے وسط میں ایک قصر تھا کہ جس پر ایک پردہ لٹکتا تھا۔ ایک متوّلی نے اُنھیں بتایا کہ یونسؑ نبی یہاں کھڑا ہوا تھا اور قصر کی محراب میں وہ حجرہ تھا جہاں وہ عبادت کیا کرتا تھا۔ قصر کے گرد کھجور کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

تنے جتنی موٹی موم بتیاں تھیں۔ اس پہاڑی کے پاس نینوا ـــــ یونسؑ نبی کے شہر ـــ کے کھنڈرات کے ڈھیر تھے۔ اُنھوں نے جمعہ ۱۶ صفر کی رات اس محتاج خانے میں بسر کی۔

"موصل کے لوگ" ابنِ جُبیر لکھتا ہے "راستبازی کے رستے پر چلتے ہیں
اور دیندارانہ کام کرتے ہیں۔ تم ان میں سے کوئی فرد ایسا نہ پاؤ گے
جو ہنس مُکھ اور پُرشفقت نہ ہو۔ اجنبیوں سے وہ فیاضی سے
پیش آتے ہیں اور ان کی دلجوئی کرتے ہیں۔ اپنے تول میں پورے
ہیں اور لین دین کے صاف۔"

وہ چار دن موصل میں ٹھہرے۔ اپنی آمد کے دوسرے روز اُنھوں نے ایک ایسا بھڑک دار نظارہ دیکھا کہ وہ اسے کبھی نہ بھُول سکے ہوں گے۔ وہ ایک حمام میں بیٹھے، ایک قسطنطنیہ کے حجام سے ڈاڑھی بنوا رہے تھے کہ یک لخت حجام نے اُسترے کو تہ کر دیا اور بولا:

"معزز مغربیو! برائے مہربانی اس وقت مجھے معاف کر دو۔ امیر مسعود
کی بیٹی آج موصل میں داخل ہو گی۔ ڈھنڈورچی ابھی آواز دیتا گزرا۔ لہٰذا
میرے لیے ضروری ہے کہ حمام کو بند کر کے اس کے استقبال
کے لیے جاؤں۔"

اُنھوں نے حجام سے حجّت بازی کی کیونکہ احمد بن حسّان کے لبوں پر ابھی اُسترا پھیرنا باقی تھا لیکن حجام نے ایک نہ مانی اور دوکان بند کرنے لگا۔ پھر اُنھوں نے دیکھا کہ ہر تاجر اپنی دوکان بند کر رہا ہے اور سب مرد چھوٹے بڑے اور عورتیں گھوڑوں پر اور پاپیادہ شاہزادی اور حاجیوں کے لینے کو دوڑے جاتے ہیں۔ موصل کے حاجی اپنی شاہزادی کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی ڈاچیوں کی گردنوں کو رنگدار ریشمی رومالوں اور آرائشی طوقوں سے سجا رکھا تھا۔ مسعودی شاہزادی اپنی باندیوں

کے دستے کے آگے آگے داخل ہوئی۔ اس کی پالکی کے گنبد پر ہلال کی شکل میں گھڑے ہوئے سونے کے چاند، ہتھیلی جتنے بڑے دینار اور خوبصورت داغ بیل کے ہار جگر جگر کر رہے تھے اور گنبد کا کوئی حصّہ نظر نہ آتا تھا۔ دو حیوان جو اسے اُٹھائے تھے پودے پودے چلتے تھے اور ان کے گھنگھرؤں کی چھنک چھنک کانوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ زیورات جو اس کے اور اس کی باندیوں کے ٹٹوؤں کی گردنوں میں جھلملاتے تھے۔ ان کا سونا مل ملا کر بے اندازہ لاگت کا ہوتا تھا۔ اس نظارہ کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں مگر:

"کل بادشاہت کو فنا ہے۔ سوائے خدا کی بادشاہت کے کہ جس کا
کوئی اس میں شریک نہیں۔"

اس طرح یہ شاہزادی ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی میں سے چلی گئی۔

موصل میں پہنچتے ہی اُنھوں نے اپنے میرِ شتر کا کرایہ دام کر چکا کر اسے جواب دے دیا تھا۔ وہ ضرور امیر ہوں گے کیونکہ اُنھوں نے بازار سے دو ٹٹو سواری کے اور دو گدھے سامان کے لیے خرید کیے۔ اور جمعہ ۲۶ صفر کی شام کو شہر کے پھاٹک سے باہر نکلے۔

ہم دو قدرے لحیم آدمیوں کا تصوّر کرتے ہیں ـــ سنجیدہ اور باریش چہرے، سر پر عمامے۔ جسم پر قبائیں اور جُبّے۔ کمر میں کسے ہوئے پٹکے جس میں اُن کے بٹوے اور نقدی ہو گی۔ ان کی ٹانگیں پستہ قد ٹٹوؤں کی زین سے لٹک کر تقریباً زمین پر گھسٹتی ہوں گی۔ ان کے دلوں میں ان پاک جگہوں کی دمک ہو گی، اور ساتھ ہی کھل سے ٹھنڈی آنکھوں میں غرناطہ کے بازاروں کی روشنیاں اور نازک دھمالتے فوارے ہوں گے جو ہمیشہ چلتے رہتے تھے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

عرب کے خوفناک اور غیر مسافر نواز صحرا کے سفر کے مقابلے میں شاداب آباد علاقے میں ٹوڈوں کا سفر ایک بچّے کا کھیل تھا۔ سفر کی ہر منزل پر بستیاں اور سرائیں پڑتی تھیں۔ جبل الجودی کو (جہاں نوح نبی کی کشتی آکر رُکی تھی) اپنے دائیں جانب چھوڑ کر وہ منگل بارہ جون، پہلی ربیع الاوّل کو بوقت دوپہر نصیبین میں داخل ہوئے۔

"جو ایک ہرے بھرے میدان میں ایک متوسط درجے کا شہر تھا۔ اندر سے شکستہ مگر باہر سے تازہ اور جمیل۔ شہر کے باہر ایک قدرتی جنّت ہے جس میں اُندلس کے درخت اور پودے ہیں۔ دریا پر پتھر کا پُل ہے۔ دو کالج اور ایک ہسپتال موجود ہیں۔"

وہ ولی شیخ ابوالیقظان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو "جسم کا سیاہ لیکن دل کا چٹا اور اُجلا ہے۔" اور اُس راہب سے جو ایک مشتِ استخوان تھا۔ ہاتھ بھی ملایا اور اپنی خوش بختی پر پھُولے نہ سمائے۔

اگلی صبح خچروں اور گدھوں کے ایک بڑے قافلے میں جس میں زیادہ حرّان اور حلب کے آدمی تھے وہ نصیبین سے رخصت ہوئے۔ وہ کردی قبائل کے حملے کے خلاف ہوشیار اور مسلّح تھے جو موصل سے نصیبین اور دُنیصر کے شہروں تک سڑکوں پر لُوٹ مار کرتے تھے۔ ابنِ جُبیر اور احمد بن حسّان کے پٹکوں میں خنجر اُڑسے ہوں گے اور ایک جنگجو قوم کے افراد ہونے کی وجہ سے وہ ان کے استعمال سے بھی بے بہرہ نہ ہوں گے۔

دوسرے دن صبح وہ دُنیصر میں داخل ہوئے۔ اس کے بازار لوگوں سے اور ہر قسم کی اجناس سے بھرے ہوئے تھے۔ کیونکہ دُنیصر مُلک شام، دیار بکر و عامد اور ان رُومی خطوں کی جو امیر مسعود کی قلمرو میں تھے پُر رونق منڈی تھی۔ شہر کے باہر جو صحرائی شہروں کی طرح فصیل کے بغیر تھا وہ نئے کالج کے پاس اُترے — باغات کے بیچ میں بنا ہوا، اور ایک ملحقہ حمام کے ساتھ۔ یہ بیک وقت ایک کالج بھی تھا اور مسافروں کے لیے ایک خوش گوار

گوشۂ عافیت بھی۔

"شہر کا فرمانروا قطب الدین، بابک کے دو بیٹوں کا ایک قرابتی ہے اور دارا، مریدین، اور راس العین کے شہروں کا حاکم بھی وہی ہے۔ یہ مُلک بھی ہسپانیہ کی عرب بادشاہتوں کی طرح مختلف فرمانرواؤں کی حکمرانی میں ہیں۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے بادشاہ خود کو لمبے چوڑے القابات سے زینت دینے کے بہت مشتاق ہیں۔ تم ان کے ناموں کے ساتھ عموماً بلند بانگ اور پُر جلال خطابات سنو گے جو دانشوروں کے نزدیک بے فائدہ ہیں اور ان میں شاہ و گدا اور امیر و غریب دونوں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ ان بادشاہوں کے القاب محض بھری ہوئی ہوا ہیں جن کے وہ بالکل لائق نہیں۔ لیکن ان دینی القاب کے اختیار کرنے میں وہ تکلّف کرتے ہیں —— بالکل بے موقع و بے حقیقت شاہی القاب! جیسے ایک بلّی شیر کی جھپٹ کی نقالی کرنے کی کوشش کرے۔"

دُنیصر سے وہ جمعہ کی نماز کے بعد چلے اور ایک بڑے گاؤں کے پاس سے گزرے جس میں ایک حصار تلّ العقاب (عقاب کی پہاڑی) کے نام کا تھا۔ یہ نصرانیوں کا گاؤں تھا جو ذمّیوں کی طرح اسلامی حفاظت کا جزیہ ادا کرتے تھے۔ انھیں اس گاؤں نے اپنی خوشنمائی اور تازگی اور اپنے تاکستانوں اور باغوں سے اُندلس کی یاد دلادی۔ ایک باغ میں اُنھوں نے پالتو سؤروں کا ایک گلّہ چرتے دیکھا۔ اور یہ امر کہ نصرانی کاشت کار وہاں سؤروں کی نسل پروری کر سکتے تھے اور اُن کے گلّے رکھ سکتے تھے۔ اسلامی حکومتوں کی انتہائی رواداری اور فیاضی کی مثال ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نصرانی فی الواقع اسلام کی حفاظت میں تھے اور اپنی عبادت اور رسوم میں مطلقاً آزاد!

toobaa-elibrary.blogspot.com

سنیچر کی صبح کو وہ ایک دوسرے گاؤں جسر روانہ ہوئے اور دوپہر کو وہ راس العین کے شہر میں تھے۔ جو اسم با مسمیٰ تھا۔ چشمے نہریں بن کر چاندی کے فیتوں کی طرح اس کے مرغزاروں کو سیراب کرتے تھے۔ دریا کے کنارے صوفیوں کے لیے ایک خانقاہ تھی، اور اس کے پاس ایک کالج، دونوں شکستہ اور اُجڑے ہوئے لیکن یہ جگہ ایک سبز جزیرہ تھی اور پانی کے رہٹ نیچے دریا سے پانی لے کر اُوپر اس خانقاہ کے باغوں میں پہنچاتے تھے۔ ہمارے مسافروں کو یہاں پھر اپنا پیارا اُندلس یاد آگیا۔

پانچ ربیع الاوّل کو وہ یہاں سے چلے اور راستے میں پڑاؤ کرتے سات کو حرّان کے شہر میں پہنچے۔ حرّان کا مطلب ہے۔ گرم۔ اور اس شہر میں واقعی کوئی خوبصورتی نہ تھی۔ اس کے کوچے اور چوک دوپہر کے سُورج میں بھٹی کی طرح تپتے تھے۔

"لیکن" ابنِ جُبیر فوراً کہتا ہے "میں خدا سے یہ لکھنے کی معافی مانگتا ہوں اس لیے کہ یہی شہر ہمارے باپ ابراہیمؑ کا قدیم مولد و مسکن تھا۔ شہر کے جنوب میں تین فرسنگ پر ایک چشمے کے کنارے پر وہ بابرکت مزار ہے جو اس کی اور اس کی زوجہ سارہ کا گھر تھا جہاں بیٹھ کر وہ عبادت کرتے تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے خدا نے اس شہر کو راہب الاولیا اور تارک الدنیا فقرا کا مسکن بنا دیا ہے جن میں سب سے ممتاز شیخ ابوالبرکات حیان بن عبدالعزیز ہے۔ ہم اس سے ہاتھ ملانے کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ شیخ کی عمر اسّی سال کی ہے۔ ہم شیخ اور راہب سلمہ سے بھی ملے جس نے ہمارے لیے دُعا مانگی اور ہم سے کئی ایک سوالات پوچھے اور ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ہم ایک اور راہب المکشوف الراس (یعنی ننگے سر والے) کی زیارت کو بھی گئے لیکن پتا چلا کہ صحرا میں سیر و سیاحت پر گیا ہوا ہے۔ اس شہر میں کئی مرنجاں مرنج لوگ رہتے ہیں جو پردیسیوں

سے مروّت اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ موصل سے لے کر شام تک ان شہروں کے لوگ اجنبیوں پر مہربان اور غریبوں کے لیے سخی ہیں۔ یہی حال گاؤں کے لوگوں کا ہے۔ ایک غریب اور تنگ دست شخص ان کے درمیان کبھی محتاج نہیں رہ سکتا۔ یہ سخاوت اور دریادلی پشت در پشت سے ان کے خُون میں رچی معلوم ہوتی ہے۔ حرّان کے بازار لکڑی کے سائبانوں سے چھتے ہوئے ہیں اور تم ان میں ایسے گُزرتے ہو جیسے ایک بڑے گھر کی غلام گردشوں میں سے۔ ہر چوراہے پر ایک پلاسٹر کا گنبد ہے"

اُنھوں نے بڑی مسجد کو بھی دیکھا جو پہلے رومیوں کا گرجا تھی —— بڑا وسیع صحن اور مرمریں ستونوں پر گنبد۔ اس کی محرابیں بہت چوڑی تھیں اور اس کے اُنیس دروازے تھے جن کے چوبی قفلوں پر بیل بُوٹے اور نقوش کندہ تھے۔ حرّان کے بازاروں کی ترتیب اور داغ بیل اُنھیں بہت خوش آئندہ لگی۔ ایک کالج اور دو ہسپتال بھی اس میں تھے۔ حاکم اس شہر کا مظفر الدین ابنِ زین الدین تھا جو سلطان صلاح الدین ایوبی کا اطاعت گزار تھا۔ موصل سے لے کر نصیبین اور فرات تک کا علاقہ دیار ربیع کہلاتا تھا۔ دیار بکر اس کے شمالی علاقے کا نام تھا۔ دیارِ ربیعہ اور دیار بکر کے سب حکمران سلطان صلاح الدین کا سکّہ مانتے تھے اور اس کے رحم و کرم پر تھے۔

منگل کو وہ راہب مکشوف الراس سے ملے جو اب اپنے سفر سے صحیح سلامت لوٹ آیا تھا۔ مکشوف کا چہرہ ایک ولی کا چہرہ تھا۔ اور اس کا طریقہ پارسائی کا! وہ ایک خوش دل اور ہنس مکھ شخص تھا اور ان سے بڑی محبّت سے ملا۔ اس نے نہ صرف ان سے ہاتھ ملایا بلکہ بغل گیر بھی ہوا۔ وہ اپنی خوش بختی پر یقین نہ کر سکے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

نوربیع کو تھوڑی سی نیند کے بعد وہ پھر اپنی زینوں پر تھے اور چاند کی روشنی سے دُھلی ہوئی سڑک پر ساری رات چلتے رہے۔ دوسرے دن فرات کو عبور کر کے وہ شام اور صلاح الدین کی سلطنت میں آ گئے۔ گیارہ ربیع کو وہ منبج میں پہنچے جہاں گھر گھر میں ایک یا دو کنوئیں تھے اور زمینیں چشموں سے مالا مال تھیں۔ بازار اور کوچے چوڑے تھے اور دوکانیں اپنی وسعت اور شان میں سرائیں اور گودام معلوم ہوتی تھیں۔ کسی زمانے میں یہ اہل روم کا قدیم شہر تھا اور رومیوں کی عمارتوں کے کھنڈرات جا بجا نظر آتے تھے۔

آدھی رات کو وہ منبج سے روانہ ہُوئے اور دوسرے دن ایک گھڑی دن چڑھے بزاعہ میں پہنچے جو ایک شہر سے چھوٹا تھا اور ایک گاؤں سے بڑا، ایک بڑا محکم قلعہ اس کے اُوپر کی جانب ایک طرف تھا جسے زمانۂ قدیم میں ایک بادشاہ فتح نہ کر سکنے کے سبب غیظ و غضب میں توڑ پھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور سامنے وادی میں ایک گاؤں "الباب" تھا۔ یعنی بزاعہ اور حلب کا دروازہ۔ آٹھ سال پہلے الباب میں اسماعیلی ملحدوں کا زور تھا۔

"ان کے کینے کے شعلے اُڑے اور ان کی شرارتوں اور غلط کاریوں نے اس سڑک کی راہ مسافروں اور رہگذاروں پر مسدُود کر دی۔ اس پر ان بختوں کے دوسرے لوگ نفرت اور غصّے سے ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہُوئے اور ان کے شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اُنھوں نے ان اسماعیلیوں کو تہِ تیغ کر دیا اور الباب میں اُن کا ایک نفس بھی زندہ نہ چھوڑا اور پھر اس وادی میں اُن اسماعیلیوں کے کٹے ہوئے سروں سے ایک اُونچا سا ڈھیر کھڑا کیا۔ خُدا نے مسلمانوں کو ان ملحدوں کی دُشمنی اور بدفطرتی کے خلاف بچا لیا اور ان کی فریب کاریوں نے خود انھی کو ختم کر دیا۔"

رات کو سفر کرتے وہ حلب میں اتوار۔ تیرہ ربیع الاوّل۔ ۲۴ جون کو پہلے پہر کے وقت داخل ہوئے۔

حلب! صلیبیوں کی سفید تلواریں اس کے خلاف کئی بار اپنی چمک دمک دکھا چکی تھیں، مگر یہ اب تک مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ پہاڑی پر حلب کا ناقابلِ تسخیر قلعہ اتنا محکم بنا ہوا تھا کہ دل پر دہشت طاری ہوتی تھی۔

"یہ شہر ازل جتنا قدیم ہے اور کوئی وقت ایسا نہیں آیا کہ حلب کی ہستی اس کرۂ ارض پر موجود نہ ہو۔ اس کے دن اور سال لمبے ہیں اور کئی بادشاہ اور لوگ اِسے آخری الوداع کہہ کر چلے گئے ہیں۔ یہ اس کے گھر اور حویلیاں موجود ہیں لیکن کہاں ہیں ان کے پرانے باسی جو کسی زمانے میں یہاں رہتے تھے؟ اور وہ اس کے دربار اور ایوان نظر آتے ہیں لیکن وہ حمدانی امراء اور ان کے شاعر کہاں چلے گئے؟ سب فنا اور فراموشی میں گزر گئے لیکن ابھی اس شہر کا وقت نہیں آیا۔ کیسی حیرت کا شہر! یہ اسی طرح قائم ہے اور اس کے بادشاہ جو پہلے آئے تھے وہ رخصت ہو گئے۔ اور اُن کے بعد دوسروں نے اس عروسِ جفا پیشہ سے منگنی رچائی اور بغیر دشواری کے اسے بیاہ میں لے آئے۔ لیکن بیبے وفا اور عشوہ طراز دولھن آسانی سے ہاتھ تو آ جاتی تھی مگر بالآخر اپنے خداوندوں کی قاتل ثابت ہوتی تھی! یہ حلب ہے! .... ہم کہتے ہیں کہ اس قلعے کا ایک بڑا فخر یہ ہے کہ ابراہیمؑ خدا کا دوست اس پہاڑی پر اپنے بھیڑوں اور بکریوں کے گلّے چَرانے جاتا تھا۔ وہاں وہ ان کو دوہتا اور اپنے باپ حرّان کے کاہن سے چوری چھپے وہ دُودھ پیاسوں کو پلا دیتا۔ اسی لیے اس جگہ کو حلب (یعنی دُودھ دوہنا) کہتے ہیں۔ اس کا قلعہ ایک مقدّس عبادت کدہ ہے جہاں لوگ دعائیں مانگتے ہیں۔ ہر ایک برج پر مسلح چوکی بیٹھی ہے اور اندر سلطان کے دیوان خانے اور شاہی اُمراء کے حجرے ہیں۔ جہاں تک شہر کا تعلق ہے اس کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

بنیادیں اور تعمیر محکم ہیں۔ اور اس کی داغ بیل بے حد جمیل۔ چوڑے بازار متوازی قطاروں میں بنائے گئے ہیں۔ اس طرح کہ آدمی ایک صنعت سے متعلق دوکانوں سے چلتا چلتا دوسری صنعت کی دوکانوں میں پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سب شہری صنعتوں کو دیکھ لیتا ہے۔ سب بازاروں پر چوبی سائبان ہیں۔ اُس کا قیساریہ ایک محصور باغ ہے۔ اس میں جا بیٹھو تو جنّت کی خواہش نہیں رہتی۔

"قیساریہ کی مسجد عمدہ اور بے حد خوبصورت ہے۔ اس کا بڑا صحن چوڑی اور وسیع غلام گردشوں سے گھرا ہوا ہے جن کے دروازے کسی محل کے دروازوں سے زیادہ خوبصورت صحن پر کھلتے ہیں ان دروازوں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ آرائشی کندہ کاری کے کام نے منبر پر اپنے ممکنات کو ختم کر دیا ہے کیوں کہ میں نے کسی شہر میں ایسا منبر نہیں دیکھا جو صنعت کا اتنا پُر حیرت نمونہ ہو۔ بالائی منزل میں چوبی ستونوں پر بھی حسین نقش منبّت کیے ہوئے ہیں۔ اور ہاتھی دانت اور آبنوس کی جڑائی ان کو اور بھی خوبصورت بناتی ہے۔ اس کے مغرب کو حنفیہ کالج ہے۔ تعمیر میں اتنا ہی جمیل و نازک جیسی یہ مسجد ہے۔ اس میں سب سے دلربا چیز اس کی جنوبی طرف ہے۔ یہاں حجرے اور بالاخانے اس طور سے بنے ہیں کہ ان کے دریچے ایک دوسرے کو چھوتے ہیں اور ساتھ ساتھ انگور کے رسیلے خوشوں سے لدا ایک منڈوا ہے۔ ہر ایک دریچے کے سامنے لٹکتے ہوئے انگور کے گچھے ہیں اور جو طالب علم بھی چاہے ہاتھ بڑھا کر بغیر کسی تکلیف کے اپنے حجرے میں سے انگور توڑ سکتا ہے۔"

خوش قسمت طالب علم! کاش ہماری یونیورسٹیاں بھی اپنے طالب علموں کو اس قسم کی سہولتیں بہم پہنچا سکتیں۔

"اس کالج کے علاوہ حلب میں چار پانچ اور کالج بھی ہیں۔ اور ایک ہسپتال

بھی، وسیع اور عظیم الشان یہ شہر خلیفہ کے رہنے کے لائق ہے لیکن اس کا تجمّل سب اندر ہے۔ باہر کی طرف ایک بڑی ندی ہے جو شمالاً جنوباً شہر کی گولائی دار فصیل کے بیچوں بیچ بہتی ہے جس میں لاتعداد پُر تکلف سرائیں ہیں اور اس ندی پر غلّہ پیسنے کی چکّیاں ہیں اور شہر کے ان اطراف کے وسط میں ندی کے کنارے کنارے کچھ باغات ہیں۔ لیکن اندر سے باہر سے جو بھی اس کی حالت ہو۔ حلب دُنیا کے ان شہروں میں سے ہے جن کا ثانی نہیں ہے۔ ہم ابو الشکر کی سرائے میں چار دن ٹھہرے۔"

اب ابنِ جُبیر بار بار اُندلس کا ذکر کرتا ہے اور جو کچھ وہ ان شاداب وادیوں میں دیکھتا ہے اس سے اس کے دل میں اپنے وطن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ قدرتاً وہ دونوں اب یادِ وطن میں ملول ہوں گے۔ اور غرناطہ کے کوچے ان کے تصور میں لہراتے ہوں گے۔ لیکن ابھی ایک طویل اور پُر صعوبت سفر اُنھیں طے کرنا باقی تھا۔

سترہ ربیع کو وہ حلب سے روانہ ہوئے۔ اٹھارہ کو اُنھوں نے اپنے دائیں کو دو فرسنگ دُور المعرّہ کے خطے دیکھے۔ زیتون، انجیر اور پستوں کے درخت سے سیاہ اُن کے پُر بہار باغات اور تاک اور خُوش ترتیب گاؤں اُنھیں پھر اُندلس کی یاد دلانے لگے۔ ان سے پرے ساحل سمندر سے اُٹھے ہوئے لبنان کے پہاڑ سر بفلک کشیدہ اُنھیں تکتے تھے۔ ان کی ڈھلانوں پر اسمٰعیلیوں کے حصار تھے۔

"وہ فرقہ جو اسلام سے ہٹ گیا اور جس نے ایک آدمی کی خدائی میں یقین کر لیا"

"ان کا 'نبی' آدمی کے رُوپ میں ایک شیطان تھا۔ سنان نامی جس نے اُنھیں جھُوٹوں اور شعبدوں سے بہکایا۔ اور اپنے جادُو اور کالے ہنروں سے اُنھیں اتنا مسحور کیا کہ وہ اس کی پرستش اور عبادت کرنے لگے۔ اُنھوں نے

toobaa-elibrary.blogspot.com

خود کو اس کے سامنے اتنا بے بس کر دیا تھا اور اطاعت کی اس حالت میں پہنچ گئے تھے کہ اگر وہ اُنھیں پہاڑ کی چوٹی پر سے گرنے کا حکم دیتا تو وہ اس کی خوشی کے لیے بڑی مستعدی سے اس کی تعمیل کرتے۔

لبنان کے پہاڑ اسلامی ملکوں اور فرنگیوں کے مُلکوں کے درمیان ایک سرحد ہیں اور ان سے پرے انطاکیہ۔ لاذقیہ اور ان کے دوسرے شہر ہیں (خدا انھیں مسلمانوں کو واپس دلائے) اس پہاڑ پر کردستانیوں کا ایک قلعہ فرنگی صلیبیوں کے قبضہ میں ہے جہاں سے وہ حماہ اور حمص پر تاخت کرتے رہتے ہیں۔ ہم حماہ میں سنیچر کو کافی دن چڑھے پہنچے اور اس کے اطراف کے ایک مسافر خانے میں فروکش ہوئے۔ حماہ سب ملکوں میں شہرہ آفاق ہے اور بڑی مدت تک وقت کا رفیق رہا ہے۔ نہ تو یہ کوئی وسیع شہر ہے اور نہ ہی عمدہ بنا ہوا ہے۔ اس کے محلّے باہم گُتھے ہوئے ہیں اور حویلیاں ایک کے اُوپر دوسری گڈمڈ حالت میں ہیں جب تم اسے نیچے دیکھتے ہو تو آنکھ کو اس کے نظارے سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ لیکن ٹھہرو!! وہ اپنے حُسن وخوبی کو اس وقت تک نقاب میں چھپائے رکھتا ہے۔ جب تک تم اس کے مخفی ترین حصّوں اور اس کے گھنیرے سایوں کو دریافت نہیں کر لیتے۔"

دریائے ارناؤط Oronote حماہ کے مشرق میں بہتا تھا —— اپنے کناروں پر پانی کے آہنی رہٹ اور باغات لیے جن کے سبز پتے سبزے کی طرح پانی کو چھُوتے تھے شہر ایک نشیب میں تھا جو ایک گہری اور چوڑی خندق دکھائی دیتا تھا۔ حماہ میں تین کالج تھے اور دریا کے کنارے پر ایک ہسپتال۔ اِرد گرد دُور دُور تک انگوروں کے تاک پھیلے ہوئے تھے۔

حماہ سے وہ سنیچر کی شام کو چلے۔ اور آدھی رات گزر چکی تھی کہ انھوں نے دریا کو شہر کے

ایک مہیب پُل پر سے عبور کیا۔

"اس دریا پر رستین کا شہر ہے جسے عُمر ابن الخطاب نے تباہ کیا تھا۔ اس کے کھنڈر دُور تک پھیلے ہیں۔ قسطنطنیہ کے رومی کہتے ہیں کہ بڑا خزانہ یہاں دفن ہے لیکن خدا اس کا حال بہتر جانتا ہے۔"

بیس جولائی کو وہ حمص میں آئے اور بر لبِ سڑک ایک سرائے میں اُترے۔

حمص میں بھی تازگی بخش حُسن اور البیلا پن تھا۔ گو اس کے اِرد گرد ایک وسیع پیاسا میدان بھی تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ شہر میں پانی دریائے ارناؤط سے ایک نہر کے ذریعے لایا گیا تھا جو ایک میل لمبی تھی۔ حمص کی سب سے قابلِ تعریف چیزیں اس کی تازہ ہوائیں تھیں جو انسان کو تنومند بناتی تھیں، نجد کی ہواؤں کی طرح! شہر میں ایک محکم حصار بھی تھا۔ قبرستان میں خالد بن الولیدؓ، اس کے بیٹے عبدالرحمٰن اور خلیفہ عُمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ کے مزار تھے۔ شہر کی دیواریں بڑی کہنہ اور مستحکم تھیں۔ سخت گتھے ہُوئے سیاہ پتّھر کی سِلوں سے بنی ہوئی! اور اس کے آہنی دروازے بلند اور ہیبت ناک تھے۔ اندر سے شہر بے ترتیب اور بیابانی تھا۔ بوسیدہ حویلیاں، جُھلسی ہوئی عمارتیں!

"اس شہر سے تم کیا توقع کر سکتے ہو جو کردستانیوں کے قلعے سے چند میل پرے ہو۔ اور جہاں سے ہر روز دشمنوں کی آگوں کے بھبوکے اُڑ کر اس کے بازاروں میں گرتے ہوں۔ ہم نے اس شہر کے ایک شیخ سے پوچھا کہ "یہاں کوئی ہسپتال بھی ہے؟"۔ اُس نے پہلے کہا کہ نہیں۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا "سارا حمص ایک ہسپتال ہے۔ یہاں کے لوگوں کو دیکھ لو"۔ یہاں ایک کالج بھی ہے۔ اِسے دُور سے دیکھو تو تم شکل وصورت اور ڈیزائن میں اُندلس کے شہر اشبیلیہ اور اس میں بڑی مشابہت پاؤ گے ...."

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہائے اُندلس!

دو دن وہ حمص میں ٹھہرے۔ بائیس ربیع الاوّل کو وہ ایک بڑے گاؤں بالقارہ میں اُترے جہاں ساری آبادی عیسائیوں کی تھی۔ پھر وہ ایک گاؤں النبک میں سلطان صلاح الدین کے تعمیر کیے ہوئے ایک مسافر خانے میں ٹھہرے جس کے دروازے آہنی تھے اور اندر پانی نلوں میں سے ایک وسطی فوارے تک پہنچتا تھا۔ حمص سے دمشق تک کی سڑک پر مسافر خانے تو تھے لیکن آبادی بہت کم۔

باغات اور مرغزاروں میں سے گزرتے وہ جمعرات ۲۴، ربیع الاوّل کو دن چڑھے آخر دمشق میں داخل ہوئے۔

دمشق — جنت بلادِ اسلام

نیا چاند بدھ وار گیارہ جولائی کو طلوع ہوا۔ تب وہ دمشق کی مقدس مسجد کے پاس دار الحدیث میں مقیم تھے:۔

"دمشق مشرق کا بہشت ہے جہاں مشرق کے دلفریب اور تاباں حُسن کی سحر طلوع ہوتی ہے۔ اسلام کے ان سب خطّوں میں آخری خطّہ جن کی ہم نے سیر و سیاحت کی۔ اور اُن شہروں کی عروس جو ہم نے دیکھے۔ وہ عطر میں بسی بوٹیوں کے پھولوں سے سجی ہوئی دُولھن، اور گلستانوں کے زربفتی ملبوسات میں سنوری ہوئی البیلی دوشیزہ ہے۔ مقامِ حُسن میں اس کا مرتبہ یقینی ہے اور اپنی عُروسی کرُسی پر وہ سولہ سنگار کیے بڑی آن سے بیٹھی ہے!

جب خداوند باری تعالیٰ نے اس کو عیسیٰ روح اللہ اور اس کی ماں کے لیے جائے عافیت چُنا تو اسے گھنیرے سائے اور لذّت دار پانی دے کر بڑی عزّت بخشی۔ اس کے ننھے دریا ہر راہ میں سے سانپوں کی طرح لہراتے ہوئے بہتے ہیں اور اس کے باغوں کی عطر بیز ہوائیں رُوح کو نئی زندگی اور تازگی بخشتی ہیں۔ جب کوئی اس جگہ پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہ اسے ایک عشوہ طراز دُولھن کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

طرح اشارے سے بلاتی ہے اور چپکے سے کہتی ہو" آؤ۔ آؤ۔ خوبصورتی کے رُکنے کی جگہ یہی ہے۔ آؤ اور دوپہر کا آرام کر لو۔"

اس کی زمین پانی کی کثرت سے اُکتائی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ یہ شہر تمنا کرتا ہے کہ کاش یہاں بھی کبھی خشک سالی ہو۔ گلستان اسے یوں گھیرے ہوئے ہیں جیسے ہالہ چاند کو یا پتیاں پھول کے دل کو۔ اللہ کی قسم وہ جو کسی نے کہا تھا کہ "اگر بہشت زمین پر ہے تو پھر دمشق بلاشبہ اس کا ایک حصّہ ہے اور اگر بہشت آسمان پر ہے تو پھر دمشق اس کی برابری کرتا ہے اور اس کی نشان میں شریک ہے" تو بالکل ٹھیک ہی کہا تھا۔"

تم جانو سب سے پہلی بات اُنھوں نے دمشق میں پہنچنے پر کیا کی؟ حجام سے ڈاڑھی منڈوانے اور دار لحدیث کے حمام خانے میں غسل کرنے کے بعد وہ سیدھے اپنے فیتے اور نوٹ بکیں لے کر دمشق کی مشہور اُمیّہ مسجد میں پہنچے۔ میں تصور کرتا ہوں کہ بے چارے احمد بن حسّان نے دبے لہجے میں بہتیرا اپنے دوست سے کہا ہوگا "کہ بھائی جبیر ابھی بڑا وقت ہے کل چلیں گے۔ سفر کی تکان تو دُور ہو لینے دو" لیکن ابن جُبیر نہیں مانا ہوگا۔

۶۳۵ء میں جب اسلامی لشکر نے نصرانی دمشق کو فتح کیا تو یہ مسجد سینٹ جان بپٹسٹ (یوحنا اصطباغی) کا گرجا تھی۔ اس سال تک عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی رسوم ایک ہی چھت کے نیچے ادا ہوتی رہیں۔ اس وقت جب عیسائیوں نے ہتھیار ڈالے تو گرجا کا آدھا حصّہ اسلامی فاتحوں کے ہاتھ آ چکا تھا۔ دوسرا آدھا حصّہ معاہدہ کی رُو سے خلیفہ عمرؓ نے عیسائیوں کے پاس رہنے دیا اور اسلامی حصّے کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ ابنِ جبیر اس مسجد کا ذکر یوں کرتا ہے:

"خوبصورتی، فنِ تعمیر کے کمال۔ حیران کن اور مکلف سنگکاری و زیبائش میں یہ دُنیا

کی سب سے مشہور مسجدوں میں سے ایک ہے۔ اس کے متعلق طرفہ ترین باتوں میں ایک یہ ہے کہ مکڑی اس میں کبھی جالا نہیں بُنتی، نہ ہی ابابیلیں اس کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ خلیفہ الولید ابن عبدالملک (۷۰۵ء – ۷۱۵ء) نے اس کی تعمیر کا ارادہ کیا تو قسطنطنیہ میں روم کے بادشاہ کو فرمان لکھا کہ وہ اپنے مُلک سے بارہ ہزار کاریگر چُن کے فوراً روانہ کریں۔ رومی نے اس فرمان کی فی الفور تعمیل کی۔ ولید نے تعمیر شروع کی اور پوری توجہ اس کام کو دی گئی۔ اس کی سب دیواروں پر سونے کی پچی کاری کی گئی اور ہر قسم کے رنگوں کے بیل بوٹے ان میں منبت کیے گئے۔ ابن المعلّی الاسدی نے اس عمارت کے احوال پر ایک باب میں لکھا ہے کہ اس کی تعمیر پر کل ایک کروڑ تیس لاکھ دینار (یعنی سات کروڑ روپیہ سے زیادہ لاگت آئی۔

ولید ہی تھا جس نے عیسائیوں سے گرجے کا وہ آدھا حصّہ لے لیا جو خلیفہ عمرؓ کے وقت سے اُن کے ہاتھ میں تھا اور جہاں وہ عیسیٰؑ اور مریم کے ڈھلے ہوئے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ پہلے اس کے دو حصّے تھے۔ شرقی حصّہ مُسلمانوں کے قبضے میں تھا اور غربی عیسائیوں کے۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ مغرب کی سمت سے شہر میں داخل ہوا اور جب وہ گرجے کے وسط میں پہنچا تو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صُلح ہو گئی۔ لیکن جب خدا کی تلوار خالدؓ ابن الولید شہر کی شرقی جانب سے دھاوا بولتا ہوا آیا تو صُلح ہونے کے وقت تک وہ آدھے گرجے پر قابض ہو چکا تھا۔ اس طرح مسلمانوں نے گرجے کے مشرقی آدھے حصّے پر تصرف جما لیا اور اسے مسجد بنا لیا۔ دوسرا آدھا حصّہ صلح کے عہدنامہ کی رُو سے عیسائیوں کے پاس بطور گرجا کے رہ گیا۔ خلیفہ ولید نے برسرِ حکومت آنے کے بعد معاوضہ دے کر اس حصّے کو عیسائیوں سے لے لیا۔ پہلے تو عیسائیوں نے لیت لعل کی۔ پھر ولید نے اس پر زبردستی قبضہ کر لیا اور گرجے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کی ریخت شروع کرادی۔ عیسائی اسقف نے بددُعا دی کہ جو کوئی اسے تباہ کرے گا وہ پاگل ہو جائے گا۔ ولید نے جواب دیا "میں خدا کی راہ میں پاگل ہونے میں پہل کروں گا۔" اور خود اپنے ہاتھوں سے اسے اکھاڑنے لگا۔ مسلمانوں نے اس کے مسمار کرنے میں دیر نہ کی۔ عیسائیوں نے خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کے زمانے میں اس کی خدمت میں پیش ہو کر فریاد کی اور وہ عہدنامہ نکال لائے جس میں صحابہ نے انھیں اجازت دی تھی کہ وہ یہ گرجا اپنے پاس رکھیں۔ خلیفہ چاہتا تھا کہ گرجے کا حصہ عیسائیوں کو واپس لوٹا دیا جائے مگر مسلمانوں کے اندر اس سے بہت اضطراب پیدا ہونے لگا۔ آخر عیسائیوں کو خلیفہ نے اس حصّے کے لیے ایک گرانقدر رقم معاوضے میں دی اور وہ مطمئن ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ قبلہ کی دیوار کی بنیاد پر پہلا ہاتھ جس شخص نے رکھا وہ ہود نبی تھا (جس پر ابدی سلام ہو) اور ابن المعلی نے بھی اپنے وقائع میں یہی بیان کیا۔ خدا اس کی بابت بہتر جاننے والا ہے اور اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ ہم 'فضائلِ دمشق' کتاب میں دیکھتے ہیں کہ سفیان الثوری نے کہا کہ اس مسجد میں ایک نماز دوسری جگہ کی تیس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور رسولؐ اللہ کی احادیث میں یہ بھی ہے کہ اس دُنیا کے تباہ ہو جانے کے چالیس سال بعد تک خدائے عزّ وجل کی عبادت اس مسجد میں ہوتی رہے گی۔"

اس مسجد کی تعمیری خصوصیات پر ابنِ جُبیر کے نوٹ، بڑے مفصّل اور طویل ہیں اور میرا خیال ہے اُس نے اور احمد ابنِ حسان نے اس کی باریکیوں پر غور کرتے اور اس کے مختلف حصّوں کی پیمائش میں کئی دن صرف کیے ہوں گے۔ کتنے پُرکشش وہ نوٹ ہیں؟ کاش کہ سارے دلآویز باب کو یہاں درج کرنا

ممکن ہوتا۔ لیکن بعض باتیں ایسی ہیں کہ اُنھیں چھوڑا نہیں جا سکتا۔

"اس بابرکت مسجد میں سب سے مرعوب کُن اس کا سیسے کا گنبد ہے۔ گھیرے میں وسیع، یہ ایک دل و دماغ پر چھا جانے والا منظر پیش کرتا ہے۔ تم دمشق میں جس طرف سے بھی نگاہ ڈالو، یہ گنبد سب اُونچی عمارتوں کے اُوپر گویا فضا میں معلّق دکھائی دیتا ہے۔ گلت اور رنگے ہوئے شیشوں کے دریچوں کی تعداد چھتیس ہے (تم دیکھتے ہو کہ ابنِ جُبیر کھڑکیوں تک کو گنتا ہے) اس کے مقصورے تین ہیں۔ ایک تو رسولؐ اللہ کے ساتھیوں (صحابیوں) کا مقصورہ ہے جو اسلام کے بعد سب سے پہلے بنا تھا۔ امیر معاویہ نے اسے تعمیر کیا تھا۔ اور اس مقصورے کے پاس ابوالدرداء کا عبادت خانہ ہے .... اس کے پیچھے پہلے معاذؓ کا محل تھا اور اب وہاں ٹھٹھیروں کا کوچہ ہے۔ مغربی دیوار میں حنفیوں کا مقصورہ ہے جہاں وہ درس و نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اس بابرکت مسجد میں کئی زاویے (حجرے) ہیں جنھیں طالب علم قرآن پاک کی کتابت اور مطالعے اور لوگوں سے ہٹ کر بیٹھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ خاص طور سے طالب علموں کے فائدے کی خاطر ہیں۔ یہ صحن خوش منظر اور وسیع ہے۔ یہ دمشقیوں کے دل بہلانے اور تفریح کی جگہ ہے۔ ہر شام تم ان کو یہاں مشرق سے مغرب باب جَیرُون سے باب برید (ڈاک کا دروازہ) آتے جاتے اپنے دوستوں سے باتیں کرتے یا اکیلے بیٹھ کر پڑھتے ہوتے دیکھو گے۔ مسجد کے تین مینارے ہیں۔ غربی طرف پر بڑے کمروں اور وسیع حجروں کا ایک اُونچا مینار ہے۔ ان سب حجروں میں دیندارانہ طریقِ حیات پر کاربند غیر ملکی رہتے ہیں۔ سب سے اُوپر کا کمرہ وہ ہے جہاں امام ابوحامد الغزالی خلوت میں عبادت کرتا تھا اور جس میں آج کل شارح اور راہب ابوعبداللہ ابن سعد اُندلسی رہتا ہے۔ دوسرا مینار غربی

toobaa-elibrary.blogspot.com

جانب ہے اور تیسرا مٹھائی فروشوں کے دروازے پر شمال کی طرف ہے۔

صحن میں تین گنبد ہیں۔ سب سے بڑا گنبد ایک برج جتنا اُونچا آٹھ مربع ستونوں پر ایستادہ ہے۔ رنگین پچی کاری سے مزین اور چمنستان کی طرح پُر بہار۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد کا خزانہ تھا۔ اس مسجد کے محاصل دوکانوں کے کرایوں اور فصلوں کی فروخت سے آٹھ ہزار دینار (ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ) کے لگ بھگ ہیں۔

صحن کی شرقی طرف ایک دروازے میں سے ایک بڑی خوبصورت اور جمیل مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ شیعہ کہتے ہیں کہ یہ علی ابن طالبؓ کا مزار ہے جو ان کی ایک عجیب وغریب من گھڑت چیز ہے۔ مسجد کے بالمقابل صحن کے غربی حصے میں ایک گوشہ ہے جس کے بالائی حصے پر نقاب پڑا ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ یہاں رہتی تھیں اور یہاں بیٹھ کر احادیث سناتی تھیں۔ دمشق میں عائشہؓ اور علیؓ کی آمد مشتبہ ہے۔ اگرچہ علیؓ کے بارے میں تو انھوں نے بطور جواز کے یہ قصہ گھڑ رکھا ہے کہ وہ یہاں خواب میں کھیلتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ شیعوں نے اس ضعیف روایت کی بنا پر یہاں مسجد تعمیر کر دی۔

اس بابرکت مسجد میں چار بار آگ سے نقصان پہنچا اور دو دفعہ بنی۔ نئے مقصورہ کے گوشے میں ایک بڑا طاق ہے جس میں حضرت عثمانؓ کا مرتب کردہ قرآن پاک کا نسخہ ہے جو انھوں نے شام میں بھجوایا تھا۔ مسجد کے چار دروازے ہیں۔ باب الزیادۃ (بڑھوتری کا دروازہ) جو ایک بڑے اور کشادہ، پرہیبت ستونوں کی ڈیوڑھی میں کھلتا ہے۔ جہاں تسبیح کے دانے بیچنے والے بیٹھتے ہیں۔ یہاں سے راستہ سواروں کے رسالے کی بیرکوں میں جاتا ہے۔ باب جیرون باب برید (ڈاک خانہ کا دروازہ) باب النطافیین (مٹھائی بیچنے والوں

کا دروازہ) شرقی، غربی اور شمالی جانب ہیں۔ باب جیرون سے نکلتے ہی بائیں کو وہ مزار ہے جہاں الحسینؓ ابن علیؓ کا کٹا ہوا سر مبارک کئی دن رکھا رہا۔

باب جیرون سے باہر جانے والے کے دائیں کو اس کے سامنے کی ستونوں والی غلام گردش میں ایک صناعانہ آلہ ہے جس سے دن کے گھنٹوں کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ ہر گھنٹے کے اختتام پر دو تانبے کے گیند دو پیتل کے ڈھلے ہوئے بازوں کی چونچوں میں سے نکل کر دو پیالوں کے اندر خود بخود ٹن سے گرتے ہیں۔ ایک باز غلام گردش کے پہلے دروازے کے نیچے اور دوسرا آخری بارہویں کے نیچے ہے۔ پیالے سوراخوں سے چھدے ہیں اور جب گیند گرتا ہے تو وہ دیوار کے اندر ہی اندر سے گیلری میں واپس آجاتا ہے تم دونوں بازوں کو گیند چونچ میں دبائے گردنیں لمبی کیے پیالوں پر ٹھونگیں مارتے دیکھ سکتے ہو۔ وہ گیندوں کو اس حیرت ناک درستی سے پھینکتے ہیں کہ تخیل کو یوں لگتا ہے جیسے یہ کوئی جادو کا دھندا ہو، جب گیند پیالے میں گرتا ہے تو ایک شور سنائی دیتا ہے اور اس گھنٹے کا مقررشدہ پیتل کی تختی والا دروازہ فوراً بند ہو جاتا ہے۔ اس طرح جوں جوں دن کے گھنٹے ختم ہوتے ہیں غلام گردش کے بارہ دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بارہ گھنٹے پورے ہو جاتے ہیں۔ بند دروازے گن کر آدمی فوراً بتا سکتا ہے کہ اب کیا وقت ہے۔

رات کو وقت بتانے کا اور طریقہ ہے۔ بارہ محرابوں پر بارہ تانبے کی سوراخ دار طشتریاں ہیں جن میں ہر ایک کے پیچھے دیوار میں جڑا ہوا ایک شیشہ ہے۔ ہر ایک شیشے کے پیچھے ایک لیمپ ہے جسے ہر گھنٹے کے اختتام پر پانی سے گھمایا جاتا ہے، اس کی روشنی پھر شیشے پر پڑتی ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

جو شعاعوں کو سوراخ دار طشتری پر معکوس کرتا ہے۔ اور دیکھنے والے کو وہاں ایک سُرخ دائرہ نظر آتا ہے۔ تم سُرخ دائروں کی تعداد سے بتا سکتے ہو کہ رات کے کے بجے ہیں اور کتنی رات باقی ہے۔

غلام گردش کے اندر ایک آدمی جو اس کلاک کے کام میں ماہر ہے اس اَمر کی دیکھ بھال کرتا ہے کہ باز ٹھیک کام کرتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ گیندیں ان کی چونچوں میں وقت پر لوٹائی جاتی ہیں یا کیوں کر؟ — یہ آلہ وہ ہے جسے منجانہ یا آبی گھڑیال کہتے ہیں۔

یہ دمشق کا کلاک یقیناً ایک حیرت کی چیز ہوگا اور اس صناع کی ذہانت کی جس نے اسے سوچا اور ایجاد کیا ہوگا داد نہیں دی جا سکتی، اس زمانے کے جدید بڑے شہروں میں بھی وقت بتانے کا اتنا خوبصورت اور مسرت بخش طریقہ کسی کو نہیں سوجھا۔ دن کو بند دروازوں کو گن لو۔ رات کو سُرخ دائروں کو — اور تمھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا وقت ہے اور پھر بازوں کی چونچوں سے گیند پیالوں میں گرتے ہوئے! اُس کے موجد کا دل ایک بچے کا دل ہوگا۔

"مغربی دروازے پر ڈیوڑھی میں سبزی فروشوں اور عطاروں کی دوکانیں ہیں۔ پھل کی دوکانوں کی ایک قطار ہے۔ آخری سرے پر ایک بلند قامت ستونوں کا مہیب دروازہ ہے جس پر سیڑھیاں جاتی ہیں اور سیڑھیوں کے نیچے دائیں اور بائیں دو پانچ پانچ دھانوں کے مرمریں فوارے ہیں۔"

اوہ! جُبیر، تم فواروں کے دہانے تک بھی گنتے ہو، فواروں سے تمھیں کتنی محبت ہے اور اس طرح یہ باب حیرت خیز چیزوں کا ذکر کرتا اور جادو جگاتا چلا جاتا ہے۔

ایک عجیب بات تو رہ گئی۔ اس مسجد میں پرانے اور نئے مقصوروں کے بیچ میں ایک ستون تھا جس کے لیے وقف کی ایک رقم مقرر تھی۔ خوش نصیب ستون! جو لوگ غور و فکر یا مطالعے کے لیے اس ستون سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے اُن کو ستون کے وقف میں سے الاؤنس ملتا تھا۔

"ہم نے اس ستون سے ٹیک لگائے ہوئے اشبیلیہ کے ایک فقیہہ اور شارح المرادی کو بھی دیکھا (بے چارے کا زادِ راہ ختم ہو گیا ہوگا!) صبح کے وقت قرآن کے ساتویں حصّے کی قرأت کی مجلس کے اختتام پر ہر شخص ایک ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سامنے ایک لڑکا دو زانو ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور اس شخص کو قرآن کا سبق دیتا ہے۔ ان لڑکوں کا بھی قرآن خوانی کے لیے الاؤنس مقرر ہے لیکن جن کے باپ متمول ہیں وہ اپنے لڑکوں کو الاؤنس لینے سے منع کر دیتے ہیں گو کہ باقی طلبہ یہ الاؤنس لیتے ہیں۔ یہ اسلام کی خوبیوں میں سے ایک ہے۔"

یتیم اور بے گھر بچّوں کے لیے بھی دمشق میں ایک بڑا اسکول تھا اور وقف اتنا فیاضانہ تھا کہ اُستادوں اور طالب علموں کے رہنے سہنے کے کل اخراجات بآسانی اس میں سے پورے ہوتے تھے۔

"ان مشرقی خطوں میں لڑکوں کو قرآن کی تعلیم و تدریس بھی دی جاتی ہے کہ وہ اسے حفظ کر لیں۔ فنِ تحریر اور کتابت وہ دوسری چیزوں کے ضمن میں سیکھتے ہیں اس طرح بڑے اور پُر جلال خدا کی کتاب لڑکوں کی نشان زدگیوں اور دستبرد سے بچ جاتی ہے۔ ان ملکوں میں قرآن پاک کے اُستاد اور لکھائی اور کمپوزیشن کے ماسٹر الگ ہوتے ہیں اور قرآن خوانی کے سبق کے بعد وہ لکھائی کے ماسٹر کے پاس کتابت کا سبق لینے کے لیے اُٹھ جاتے ہیں۔ اُن کا یہ طریقہ بڑا عمدہ ہے۔ لڑکے بڑے خوش خط اور زرین رقم بن جاتے ہیں کیونکہ کمپوزیشن کا اُستاد اُنھیں صرف لکھنے کی ہی مشق کراتا ہے۔ وہ اپنی ساری کوشش اسی کے سکھلانے میں صرف کرتا ہے اور شاگرد اسی کے سیکھنے میں۔"

یہ طریقہ ہمارے ماہرینِ تعلیم کو بہت کچھ سکھلا سکتا ہے جو بچّوں کے دماغوں کو بیک وقت مختلف مضامین سے پریشان کرنے پر مُصر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کالج کے بعد ان کے دماغ خالی

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہوتے ہیں اور وہ کوئی کتاب اُٹھا کر نہیں دیکھتے ۔

اکثر دونوں اُندلسی دمشق کے گلی کوچوں میں گھومنے نکل جاتے جو تنگ اور ٹیڑھے میڑھے تھے۔ مگر ہر کوچے و بازار میں ایک آدھ فوارہ ہوتا تھا۔ دمشقی ان اجنبیوں سے بڑی خوش دلی اور مروّت سے ملتے اور اُنھیں ایسا لگتا کہ وہ اپنے وطن میں ہیں۔ ان کے کئی طریقے اور آداب تو ان کو بڑے عجیب لگتے۔ مثلاً ان کا معانقے کا طریقہ جو بے حد پُر تکلّف اور غیر ضروری طور پر طویل تھا۔ جب دو دمشقی آپس میں ملتے تو دیر تک جُھک جُھک کے آداب بجالاتے اور لکھنویوں کی طرح مجرا عرض کرتے۔ ان کی گردنیں اُٹھتیں، جُھکتیں، ہچیلتیں اور سکڑتیں۔ ایک ذرا سیدھا ہوا تو دوسرے کی جُھکنے کی باری آئی اور اکثر ان کے عمامے ٹکرا کر گر جاتے"۔ ان کے معانقے کا طریقہ" ابنِ جُبیر تر چھے پن سے کہتا ہے

"جو نماز میں رکوع سے ملتا ہے یا تو ہم نے غلام لونڈیوں میں دیکھا ہے یا جب باندیاں کوئی عرض کرتی ہیں۔ کیسے عجیب ہیں یہ لوگ؟ پازیب چھنکانے والیوں کے طور طریقے یہ کیونکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ انہماک سے ایسی باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں جو خود دار طبیعتوں کے لیے قابلِ نفرت ہیں اور خود کو گرانے کی لعنت کے مرتکب ہوتے ہیں جسے اسلامی شرع منع کرتی ہے۔ ان کے کئی رواج تکلّف کی انتہا ہیں"۔

اوہ ابنِ جبیر! تمھارے اندر یقیناً حسِ ظرافت نہیں ہے۔ تم دو معصوم دمشقیوں کے ہنسانے والے پُر لطف معانقے پر اتنے سنجیدہ کیسے ہو سکتے ہو جب کہ وہ برسرِ بازار اپنے پُر وقار عمامے بھی سروں سے کھو دیتے ہیں۔

"دمشقی ایک دوسرے کو مولائی (میرے آقا) اور سیّد (جناب عالی) لے سوا مخاطب نہ کرتے اور دو دمشقیوں کی ملاقات پر "آپ کا غلام" اور "فضیلت مآب"

وغیرہ الفاظ کا تانا بندھ جاتا ہے۔ ایک دمشقی واقفِ کار کو دُور سے آتے دیکھتے ہی عام سلام دُعا کے بغیر اُس کا دوست جھک کر ملکارتا "آداب بجالاتا ہوں، فضیلت مآب"۔ پہلا قدرے جُھک کر چہکتا "مولائی آپ کا غلام ہوں"۔ اس طرح طرفین کا جُھکنا ایک دوسرے سے بڑھتا جاتا۔ حتیٰ کہ ان کی پُر تمکنت ڈاڑھیاں زمین پر جھاڑو دینے لگتیں اور اس عرصے میں وہ ایک دوسرے کو تعظیم اور افتخار کے القاب سے سرفراز کرتے رہتے۔ جب جُھکنا تدریجاً کم ہو جاتا تو ان کی گفتگو بڑے تکلّف اور انکساری کے انداز میں شروع ہوتی :

"فضیلت مآب! طبع مبارک تو اچھی ہے"۔

"مولائی! شکر ہے۔ سرکار کے مزاج گرامی کیسے ہیں"۔

"قبلہ ام بہتر ہوں، آں جناب دولت کدے سے تشریف لاتے ہیں؟"

"خداوند نعمت! اب فقیر اپنی جھونپڑی کو لوٹتا تھا، مولائی کے آستانۂ اقبال پر سجدہ دینے حاضر ہوا تھا"۔

"اوہو محسن اعظم یہ حقیر ذرا اپنی پھوپھی کے ہاں گیا تھا لو اب چلیئے اس حقیر و بے حیثیت غلام کے ساتھ۔ اور میری گھاس پھونس کی جھونپڑی کو قدم مبارک سے ہمسرِ آفتاب کیجیے"۔

"سیّد! کچھ عرض معروض درگاہ عالی میں کرنا تھا پھر حاضر ہوں گا"۔

"خداوند نعمت، یہ عاجز۔ آپ کا پروردہ ہے۔ دہن مبارک سے حکم دیجیے۔ بندہ فرمان بجالائے گا"۔

یہ پُر تکلف آداب دمشقیوں کے لیے زندگی کو اُلجھا ہوا مگر شیریں بناتے تھے اور وہ ان کی تہذیب کی جان تھے لیکن ابنِ جُبیر کو یہ تکلفات قطعاً نہ بھاتے۔ متوسط الحال طبقے کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ امیر غریب کی برابری نہیں دیکھ سکتا تھا خواہ وہ زبانی کلامی ہی کیوں نہ ہو.... اور کارل مارکس

toobaa-elibrary.blogspot.com

ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے :

"اگر وہ ایک دوسرے سے یہ مروّت برتتے ہیں اور اپنی عام ملاقات میں القاب کو اس دریادلی سے لٹاتے ہیں تو خدا جانے وہ اپنے سے اُونچے رُتبے کے لوگوں کو کن الفاظ سے خطاب کرتے ہوں گے۔ ان لوگوں کے لیے دُم سر کے برابر ہے اور وہ اپنے آداب میں حاکم اور محکوم کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھتے۔ خدا کی شان کی تعریف ہو کہ اُس نے ہر قسم کے لوگ پیدا کیے (یعنی دمشقیوں کی قسم کے لوگ بھی) اس کی ذات یکتا و تنہا ہے جس کا کوئی شریک نہیں "

"ان ملکوں میں ایک انوکھی عادت لوگوں کی یہ ہے کہ بڑے اور چھوٹے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ کر چلتے ہیں۔ (رسّی سے باندھ کر نہیں) وہ اسی حالت میں ایک دوسرے کو مجرا عرض کرتے ہیں یعنی ہاتھ پیچھے بندھے ہیں اور جُھکے جا رہے ہیں۔ وہ دوسرے شخص کے سامنے اپنی اطاعت، عجز اور تکریم کے اظہار کی خاطر کرتے ہیں گویا کہ کسی نے اُنھیں مارا پیٹا ہے اور ان کے ہاتھوں کو قیدیوں کی طرح پشت پر باندھ دیا ہے۔ وہ اس طرزِ خرام کی بابت سمجھتے ہیں کہ اس طرح چلنے سے وہ معزز اور پُروقار لوگوں کی حیثیت سے الگ پہچانے جاتے ہیں اور یہ کہ اس سے ان کے اعضاء تکان سے بچ جاتے ہیں اور آرام میں رہتے ہیں (اُنھیں اعضاء کو ڈھیلا چھوڑنے کا فن معلوم تھا جسے امریکن آج کل سکھلا رہے ہیں) اُن میں بادشاہ وہ ہوتا ہے جس کے فرغل کا دامن ایک بالشت بھر زمین پر گھسٹتا چلا جائے یا جس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوں۔ اُنھوں نے اس طرزِ خرام کو اپنے اُوپر فرض کر لیا ہے اور ان میں ہر ایک نے اپنے آپ کو اس بُری عادت کا خُوگر بنا لیا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اچھی ہے۔ میں ان کے لیے خدا کی بارگاہ میں معافی کا طالب ہوں۔"

لیکن دمشقیوں کی ایک اور عادت اُندلسی سیّاح کو بڑی اچھی لگی جس کی بدولت اس کا خیال

ہے کہ شاید خدا ان کو معاف کر دے، وہ تھی ان کی ہاتھ ملانے کی عادت۔ نماز کے بعد جب امام سلام کہہ چُکتا تو لوگ اُٹھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے اور پھر بڑھ کر ایک دوسرے سے مصافحے کرتے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ ہر شخص نے ہر دوسرے شخص سے ہاتھ نہ ملا لیا ہوتا "یہ ایک فائدہ مند عادت ہے جس کا خدا اُنھیں معاوضہ دے گا"

لیکن ان کی رُسومات مرگ فی الواقع عجیب تھیں۔ وہ جنازے کے آگے آگے قرآن خوانوں کے ساتھ چلتے جو بڑی جگر دوز اور پُرسوز آواز میں آیات پڑھتے جاتے۔ دونوں رقیق القلب اُندلسی کئی بار لوگوں کے جنازے جاتے دیکھ کر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ ہر ایک میّت گرجا، مسجد میں مقصورہ کے سامنے رکھی جاتی تھی اور کیونکہ ہمارے سیّاح وہاں پر روز جاتے تھے۔ ان کو کم از کم چار پانچ متوفی دمشقیوں کی نماز جنازہ تو ضرور پڑھنی پڑتی تھی۔

"وہ بعض اوقات قل کی رسم کے لیے صحن کے غربی مسقف راستے میں جمع ہو جاتے جو باب البرید کے پاس ہے۔ مجلس میں ہر ایک شخص اُٹھ کر آیات پڑھتا اور پھر بیٹھ جاتا۔ اُن کے سامنے قرآن پاک کے نسخے کُھلے ہوتے جن کو وہ پڑھتے جاتے۔ رسوماتِ سوگ کے مہتمم باآوازِ بلند شہر کے معزز اور باحیثیت لوگوں کی آمد کا اعلان کرتے رہتے۔ اور ان کے ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے افتخاری اور اعزازی القاب جوڑتے جاتے، جن کی اُنھیں بہت مشق تھی اور جو ہر کہ و مہ کے لیے ایک سے ہوا کرتے تھے۔ یہ کون آتا ہے؟ یہ جناب استاد العلماء، صدر الافاضل، حکیم الامت صدر الدین ہیں۔ یہ معلّی الالقاب جمال الامامہ، حجت الاسلام۔ فخر الشریعہ جناب بدر الدین ہیں۔ یہ شرف الملت۔ منتیٔ فریقین، علامۃ الدہر جمال الدین ہیں۔ یہ القاب ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ ہر تاج العلماء یا عمدۃ الملک لقا کبوتر بنا اور غرور سے اپنے فرغل کو گھسٹتا اپنی مسند پر جا بیٹھتا۔ جب قل خوانی ختم ہو جاتی تو مبلغ ایک ایک کر کے اُٹھتے اور اپنی لیاقت و استطاعت کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

مطابق مرحوم کا ذکرِ خیر کرتے ۔ چار روزہ دُنیا کے فریبوں سے حاضرین کو آگاہ کرتے اور مناسب اور برمحل اشعار پڑھتے ۔ جب وہ سب اپنی فصیح اور طویل تقریریں کر چکتے تو لوگ جانے شروع ہوتے ۔ اکثر اسی قسم کے سوگ کی مجلس ہوتی ہے جو شامل ہونے والے کے لیے فائدہ بخش ہوا کرتی ہے ۔"

دمشق کے لوگ اپنے سلطان —— سلطان صلاح الدین ایوبی — کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کرتے تھے ۔ ہمارے سیّاح سلطان کو دیکھنے سے محروم رہے جس کا انھیں بڑا شوق تھا ۔ جس دن وہ دمشق میں اُترے تو سلطان پہلے ہی اپنی فوج کے ساتھ کرک کے فرنگی قلعے کے محاصرے کے لیے کوچ کر چکا تھا ۔ اور ان کے دو ماہ کے قیام میں وہ دمشق میں واپس نہیں لوٹا ۔ اس طرح وہ ان وقتوں کی سب سے درخشاں اور عظیم شخصیت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے ورنہ یہ گھر میں بچّوں اور لوگوں کو سنانے کی ایک کہانی ہوتی ۔

"چونکہ اس مُلک کے شمال کو کوئی ایسی سرزمین نہیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہو اور شام کا بیشتر علاقہ فرنگیوں کے زیرنگیں ہے ۔ خدا نے اپنی رحمت سے مسلمانوں کو یہ سلطان دیا ہے جو کبھی آرام کے کمرے میں نہیں جاتا ۔ نہ ہی چین سے بیٹھتا ہے ۔ اس کا کونسل کمرہ اس کے بہادر رہوار کی زین ہے اور ہر وقت وہ اللہ کے دشمنوں کے خلاف شمشیر بدست ہے ۔ ہم کو ایک دمشقی ماہرِ قانون اور محدّث کا سلطان کے بارے میں ایک لکچر سُننے کا اتفاق ہوا ۔ لکچر ہال میں کئی پروفیسر ۔ عالم اور قاضی موجود تھے ۔ مقرر ابھی ابھی میدانِ جنگ میں سلطان سے مل کر لوٹا تھا ۔ اُس نے سلطان کی راستبازی کو تسلیم کیا اور اس کے جواز میں تین حکایات پیش کیں ۔ ایک تو اس کی خصلت میں رحم اور کریم النفسی کے متعلق تھی ۔ اس نے کسی امیر کے جرم کو معاف کر دیا تھا ۔ جس نے اُس سے غداری کی تھی اور معاف کرتے وقت سلطان نے کہا ۔ "مجھے

یہ زیادہ پسند ہے کہ رحم دلی کی وجہ سے میرا نشانہ خطا ہو جائے بہ نسبت اس کے وہ سزا کے لیے ٹھیک اپنی جگہ جا کر بیٹھے ۔" یہ ہے وہ عفو پروری جو احناف کا مقصد تھی ۔ پھر ایک غزل گو شعراء کے مشاعرے میں جو اس کی صدارت میں ہوا اور جس میں بعض اُستادوں نے قدیم بادشاہوں کی فیاضی اور اوصاف کے مضمون باندھے ۔ سلطان نے کہا "یا اللہ ۔ اگر میں یہ دُنیا اس کو دے دوں جو اس کی اُمید میں میرے پاس استدعا لے کر آئے ۔ تو میں سمجھوں گا کہ میں نے کچھ زیادہ نہیں دیا ۔ اور اگر میں اس کی جھولی میں وہ سب زر جواہر جو میرے خزانے میں ہیں اوندھا دوں تو بھی وہ اُن کے مانگنے کی شرم کی سُرخی کا مداوا نہیں بن سکتے ۔" یہ فیاضی امین الرشید اور جعفر کا طریق تھا ۔

تیسری کہانی دمشقی قانون داں نے یہ بیان کی کہ اس کے ایک چہیتے اور مُنہ چڑھے غلام نے اس کے پاس ایک اونٹ والے کی شکایت کی کہ اس نے مجھے ایک عیب دار اونٹ دھوکے سے بیچ دیا ہے ۔ سلطان نے کہا "میں کیا کر سکتا ہوں ۔ مُسلمانوں پر ایک قاضی ہے جو ان کے درمیان فیصلے کرتا ہے ۔ ہمارے شرعی قوانین کا انصاف شاہوں اور عام لوگوں دونوں پر حاوی ہے اور اس کے احکام اور فیصلے ہم سب کو ماننے پڑتے ہیں ۔ میں تو قانون کا خادم ہوں اور اس کا شحنہ (یعنی امیرِ پولیس) ۔ قاضی کے پاس جاؤ اور وہ تمھارے خلاف فیصلہ دے یا حق میں ۔ یہ اس کا اور قانون کا کام ہے ۔" اس کہانی میں ہمیں عمرؓ کا طریقہ نظر آتا ہے ۔ یہ حکایات سلطان کی عظمت کی دلیل میں کافی ہیں ۔ خدا اپنی رحمت سے اسے اسلام اور مسلمانوں کے لیے دیر تک زندہ رکھے ۔"

سلطان صلاح الدین یقیناً تاریخ کے صفحے پر ایک چمک دار پُرکشش نقش ہے اور اس کے جانی دشمن صلیبی جنگ جو بھی سلادین Saladin سے محبّت کرتے تھے ۔ ایسے کردار —— شجاع ، نڈر ۔ فراخ دل اور فیاض [illegible] زیادہ نہیں ہوئے ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

قیامِ دمشق

لیکن دمشق میں اُمیّہ مسجد کے علاوہ اور بھی کئی حیرت ناک جگہیں اور روضے تھے - وہ وہاں دو ماہ ٹھہرے اور اُنھوں نے اُن میں سے ہر ایک کی زیارت کی -

یحییٰ ابنِ ذکریا (عیسائیوں کا جان بپتسٹ) کا سر صحابیوں کے مقصورے کے دائیں طرف کے گوشے کے سامنے مسجد کی جنوبی نشستوں کے درمیانی راستے میں دفن تھا - اس کے اُوپر ایک لکڑی کا صندوق تھا جس پر ایک بڑے پیالے کی شکل کا بلوریں لیمپ دھرا تھا - ابنِ جُبیر یہ تحقیق نہ کر سکا کہ آیا وہ بلور عراقی یا صوری شیشے کا بنا ہوا تھا یا کسی اور چیز کا !

اور اُنھوں نے ابراہیمؑ کی جائے پیدائش بھی دیکھی ــــ بَرَاہ کے خوُب صُورت گاؤں میں کوہ قاسیون کی ڈھلان پر ، یہ ایک تنگ اور لمبی غار تھی - اور اس پر ایک بڑی اور اُونچی مسجد تعمیر تھی -

"اس غار سے ابراہیم نے پہلے تاروں کو دیکھا تھا - پھر چاند کو اور پھر سُورج کو جیسا کہ خدائے عزّ و جل نے اپنی عظیم اور الوہی کتاب میں فرمایا ہے - یہ ہمیں حافظ نے بتایا - نیز شاہی مُحدّث ابوالقاسم ابن ہبتہ اللہ ابنِ عساکر دمشقی نے اپنی تاریخ 'دمشق کی کہانی' جو سو سے زائد جلدوں میں ہے میں بھی لکھا ہے - وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ باب الفردوس اور کوہ قاسیون کے درمیان ستر ہزار

نبیوں کی قبریں ہیں - دوسرے کہتے ہیں کہ ستر ہزار شہداء تھے - اور نبیوں کی تعداد جو یہاں دفن ہیں - خدا بہتر جاننے والا ہے"

"کوہ قاسیون پر ابراہیم کی بابرکت جائے پیدائش سے میل بھر مغرب کو ایک اور غار ہے جس کا نام 'خوُن کا غار' ہے - کہا جاتا ہے کہ اس کے اُوپر پہاڑ پر ہابیل کا خوُن ہے جسے اس کے بھائی اور آدم کے بیٹے قابیل نے قتل کیا تھا - خوُن کا نشان پہاڑ کے اُوپر سے لے کر غار تک ہے اور خدا نے اس کے چھینٹوں کو پہاڑ کے پتھروں پر محفوظ کر دیا ہے - یہ خدا کے معجزات میں سے ایک ہے ــــ ہم ابن المعلّی الاسدی کے وقائع میں پڑھتے ہیں کہ اس غار میں ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، لوط اور ایوب (ان سب پر سلامتی ہو) عبادت کرتے رہے - اس کے اُوپر ایک مکمل صناعی کی مسجد ہے . . . ."

"پہاڑ کے اُوپر ایک کہف ہے جسے آدم کی کہف کہتے ہیں - اس کے نیچے پہاڑ کے دامن میں بھُوک کا غار ہے جہاں ستّر نبی بھُوک سے جاں بحق ہوتے - ان کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا تھا - جسے وہ ایک دوسرے کو کھلانے پر بضد رہے اور ایک سے دوسرے کو اسے گزارتے رہے یہاں تک کہ ان کے وقت نے اُنھیں آن لیا - اس کے نام پر بھی باغات - قابل کاشت زمین اور گھروں کی ایک جائداد وقف ہے - جیسا کہ یہاں پر مسجد، کالج، سکول یا خانقاہ یا محتاج خانے کے نام ہے - اس پہاڑ کے سرے پر جہاں تاکوں کا مغربی میدان ختم ہوتا ہے - وہ بابرکت پہاڑی ہے - جہاں حضرت عیسیٰؑ اور اُن کی ماں رہتے تھے - یہ ایک اُونچے حصار کی مانند ہے جس پر تم زینے کی مدد سے پہنچتے ہو - اور بابرکت مکان اس کے وسط میں ایک چھوٹے کہف کی شکل میں ہے اور اس کے ساتھ حضرت خضرؑ کی عبادت گاہ ہے - ثورا نام کی ایک ندی اس پہاڑی

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے نیچے بہتی ہے۔ بعض وقت کوئی دلیر تیراک۔ لڑکا یا جوان پہاڑی پر سے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اور پانی کی رَو اُسے دھکیلتی ہوئی پہاڑی کے نیچے کی کٹی ہوئی آبنائے میں سے دوسری طرف لے آتی ہے۔ یہ بڑا خطرناک شغلہ ہے۔"
دمشق کے مشرق کو بیت لاہیہ کا گاؤں تھا۔ یعنی خداؤں کا گھر۔ وہاں بھی وہ گئے۔
" یہاں ابراہیمؑ کا باپ آذر جو بعل کا سردار کاہن تھا۔ مُورتیاں ڈھالا کرتا تھا لیکن خُدا کا دوست ابراہیمؑ آکر اُنھیں توڑ دیتا۔ آج کل یہ مسجد ہے۔ اس کی چھت پر مرمر کی پچی کاری ہے اور یہ انوکھے اور طرفہ نقش و نگار کی وجہ سے ایک خوبصورت قالین کی مانند ہے۔ موجودہ امام کی ماہانہ تنخواہ سلطان کی طرف سے پانچ دینار ہے۔ جو پہاڑی کے محاصل اور وقف کے علاوہ ہے اس کا نام ابوالربیع سلیمان ابن ابراہیم ہے اور وہ سرحد کے مسوئی لوگوں میں سے ہے۔ سلطان کی بارگاہ میں اس کو رسائی ہے۔ ایک مہربان اور مشفق انسان!
وہ مغربی اجنبیوں کے لیے جو ان علاقوں میں بے یار و مددگار ہوتے ہیں ذریعہ معاش اور روزی مہیا کرنے کے کام پر مامور ہے۔ مثلاً مسجد کی امامت۔ کسی سکول میں معلّمی۔ کسی کلیسا مسجد کے زاویہ میں خادمی (جہاں وہ قرآن کے ساتویں حصّے کے روزانہ ختم میں شریک ہو کر روزی کما سکتا ہے) یا کسی بابرکت مزار کے مہتمم کا منصب (جہاں اُسے وقف سے کچھ وظیفہ مل سکتا ہے) اور اس قسم کے دوسرے کام۔ اس طرح ایک حاجت مند غیر ملکی اگر وہ ٹھیک نیّت سے اس ملک میں آیا ہے کبھی دست نگری کی ذلّت کو نہیں پہنچتا۔ ہر طرح اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ دوسرے غیر ملکی جو پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور کوئی ہُنر یا پیشہ جانتے ہیں اُن کے لیے بھی گذران کی مختلف صورتیں نکالی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی باغ کی رکھوالی۔ کسی حمام کی نگہبانی یا حمام کرنے والوں کی پوشاکوں کی

حفاظت۔ کسی چکّی کی مہتممی۔ لڑکوں کی محافظی یعنی اُنھیں سکول پہنچانا اور پھر وہاں سے گھر لے آنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کاموں کے لیے مقامی لوگ مغرب کے غیر ملکیوں پر ہی اعتماد کرتے ہیں کیونکہ اُن کی ایمانداری کی شہرت اُونچی ہے۔ اور مُلک میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس شہر کے لوگ اپنے ہم وطنوں پر زیادہ اعتماد نہیں کرتے۔ یہ خداوند باری تعالیٰ کا غیر ملکیوں پر انعام ہے۔ اور جو کچھ اُس نے اپنے بندوں کو عطا کیا ہے اس کے لیے اس کی تعریف اور تشکّر ہو! اوقاف کے ان غیر ملکیوں میں سے اگر کوئی شخص سلطان کی باریابی کا متمنّی ہو تو سلطان اس سے ملے گا اور اس سے فیاضی کا سلوک کرے گا۔ اکثر اس کی قابلیت اور عہدے کے مطابق اس کی تنخواہ بھی سرکاری خزانے سے لگ جائے گی۔"
اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں اُندلسی اتنی مدّت دمشق میں کیسے ٹھہرے رہے؟ کیا وہ بے کار رہے یا اُنھوں نے امام ابوالربیع سلیمان کی مدد سے کوئی ملازمت وغیرہ کر لی۔ ابنِ جُبیر تو کسی بابرکت مزار کی مہتممی کے لیے موزوں ترین شخص تھا۔ اور اس منصب پر وہ ایک بچّے کی طرح خوش رہتا۔ احمد بن حسّان دمشق کے بڑے ہسپتال میں پارٹ ٹائم طبیب و جرّاح بن سکتا تھا اور اچھی تنخواہ پاتا۔ آج کل کے ڈاکٹروں کی طرح لالچی ہوتا تو دو مہینوں میں اچھے خاصے پیسے پیدا کر لیتا۔ اگر دوسرے طبیب ایک نئے غیر ملکی طبیب کی آمد پر احتجاج کے طور پر ہڑتال کر دیتے۔ تو بھی احمد ابن حسّان کے لیے دمشق میں کئی اور کام تھے۔ حمام کرنے والوں کی پوشاکوں کی نگرانی یا لڑکوں کی محافظی کا کام تو اُسے چٹکی میں مل جاتا۔ میرا خیال ہے کہ گو اُنھوں نے ملازمت نہیں کی۔ اس کے ممکنات دماغ میں ضرور ہوں گے۔ یہ یقینی ہے کہ دارِ تحدیث میں اُن کا قیام و طعام مفت ہو گا۔ ورنہ وہ کسی سرائے میں کیوں نہ ٹھہرے۔
لیکن کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سلطان صلاح الدین اپنی رعیّت کے لیے ایک

toobaa-elibrary.blogspot.com

باپ تھا۔ اور یہ کہ دمشقی کئی لحاظ سے ہم سے زیادہ اچھے اور خوش قسمت تھے۔ اور ان کے ہاں ایک قسم کا ایمپلائمنٹ ایکسچینج تھا۔ لوگوں کو بسانے اور اُن کے لیے روزگار مہیا کرنے کا محکمہ ۔ تاکہ نہ کوئی گداگری کرے نہ فاقوں مرے۔

شہداء کے مزاروں کے قبرستان میں جاکر اُنھوں نے رسول کے ساتھیوں۔ ساتھیوں کے پیروؤں اور اماموں کی قبروں پر دُعائے فاتحہ پڑھی۔ ابوالدرداء۔ اس کی بیوی امّ الدرداء فضالہ ابن عبید اور معاویہ بن ابی سفیان کے خالو سہل بن الحنظلیہ (جنھوں نے درخت کے نیچے رسولؐ کی اطاعت کا حلف اُٹھایا)۔ نیز واثلہ بن الاسقع (یکے از اصحاب صُفّہ) کی لحدیں بھی اسی قبرستان میں تھیں۔ ان کے علاوہ اَوس بن اوس الثقفی اور اللہ کے نبی کے مؤذن بلال ابن حمامہ بھی یہاں آرام کرتے تھے۔

علی ابن ابی طالب کے مزار میں محراب پر ایک بڑا پتھر تھا جو درمیان میں سے ٹوٹ گیا تھا۔ اور اب اس خُوبی سے جوڑ دیا گیا تھا کہ شگاف کا کوئی نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔

”شیعہ کہتے ہیں کہ یہ علیؓ کی خاطر دو ٹکڑے ہوا تھا ـــــ یا تو اس کی تلوار کی کاٹ سے یا خدا کے حکم پر اس کے ہاتھ کی ضرب سے۔ لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ علیؓ کبھی دمشق میں داخل ہوا تھا۔ اوہ میرے خدا! شیعہ کہتے ہیں کہ اُسے کسی نے خواب میں یہاں دیکھا تھا۔ شاید شیعوں کے لیے خوابیں اصلیت اور خود آگاہی کے واقعات سے زیادہ مستند ہیں۔“

جمادی الاولےٰ کا نیا چاند نکلا۔ اور اب بھی وہ دمشق میں تھے۔

وہ مسلسل اور انتھک پھرتے ہوں گے ـــــ شہر کے دروازوں کو گنتے اور ان کی

پیمائش اور معماری خصوصیتیں نوٹ کرتے۔ کالجوں کو دیکھتے۔ حماموں کی تعداد کا پتا لگاتے ابنِ جُبیر کی نگاہ کسی چیز پر سرسری نہیں پڑتی۔ وہ ایک فوارے کو دیکھتا ہے تو اس کے دہانوں کو بھی گن لیتا ہے۔ وہ ایک بلور کا پیالہ دیکھتا ہے تو یہ تحقیق کیے بنا نہیں رہ سکتا کہ بلور عراق کے شیشے کا ہے یا کسی اور جگہ کا۔ یہ قدیم وقائع نگار اور عالم اور مورخ کتنے نکتہ سنج اور دقیق اور چیزوں کی باریکیوں میں جانے والے ہوتے تھے اس شامی محدث ابوالقاسم کا تصور کرو جس نے ”دمشق کی کہانی“ سو سے اُوپر جلدوں میں قلمبند کی۔ اُس نے ساری زندگی اسی کام میں لگا دی ہوگی۔ اور ہم سگرٹ پیتے ہوئے ان قدیم لوگوں پر ہنستے ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ہم اُن کے جوتے صاف کرنے کے قابل بھی نہیں۔ باوجود اس کے کہ ہم میں سے بعض نے ایٹم بم ایجاد کر لیا ہے۔

دمشق کے اطراف دُور دُور تک پھیلے تھے لیکن شہر بذاتِ خود اتنا بڑا نہ تھا۔ کوچے تنگ، تاریک اور پیچدار تھے۔ اور حویلیاں گارے اور سرکنڈوں کی بنی ہوئی اکثر سہ منزلہ تھیں۔ اس لیے یہ شہر آتش زدگیوں میں کئی بار تباہ ہوا۔ اس کی آبادی بڑی گنجان تھی۔

شہر کے اندر عیسائیوں کا سینٹ مریم کا کلیسا تھا ”یہ ایک بانکی عمارت ہے۔ حسین تصویروں سے مزیّن، جو عقل کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہیں اور نگاہ کا دامن تھام لیتی ہیں۔ یہ رومی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو یہاں اپنی عبادت کرتے ہیں۔ انھیں اس کے اندر بالکل تنگ نہیں کیا جاتا۔“

شہر میں بارہ کالج تھے۔ دو بڑے ہسپتال ایک پرانا دُوسرا نیا۔ نئے ہسپتال کے لیے روزانہ پندرہ دینار کا الاؤنس بیماروں کے اخراجات کے لیے مقرر تھا۔ اور عملے کے پاس رجسٹر تھا جس میں بیماروں کے نام پتے، ان کے لیے تجویز کردہ دواؤں، کھانا اور دوسری چیزوں کی تفصیلات باقاعدہ رکھی جاتی تھیں۔ سرکاری طبیب و جرّاح ہر صبح آکر بیماروں کو دیکھتے تھے اور نسخے لکھ دیتے تھے۔

”پاگلوں اور ذہنی مریضوں کے علاج بھی دمشق کے ڈاکٹر کرتے ہیں۔ یہ مریض آہنی زنجیروں سے بندھے ہوتے ہیں۔ ہم اس آزمائش اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

تشدید عارضے سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ ان میں سے بعض بڑی دلچسپ حرکات کرتے ہیں۔ اور کسی وقت ایسی لطیف ظریفانہ بات ان کے مُنہ سے نکل جاتی ہے کہ سُننے والا مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک بڑی ہنسانے والی کہانی جو ایک حجّام نے مجھے سُنائی یہاں کے ایک پاگل لڑکے کی تھی۔ یہ لڑکا پاگل ہونے سے پہلے مسجد امیّہ میں قرآن کا درس دیا کرتا تھا شہر کے متموّل امیر کا ایک بیٹا جو کچھ خوشرو اور نازک اندام تھا اور جس کا نام نصراللہ تھا اس شخص سے پڑھا کرتا تھا۔ یہ شخص اس لڑکے کی صورت پر والہ و شیدا ہو گیا۔ آخر اس کا رومان یہاں تک بڑھا کہ اس کا دماغ چل گیا۔ اسے ہسپتال میں لے آئے۔ اس کی بیماری اور جنون ضرب المثل ہو گئے۔ اس کا باپ پاگل خانے میں اسے دیکھنے جایا کرتا۔ ایک دن باپ نے اسے کہا "جاؤ اور قرآن کو اُسی حصّے سے شروع کرو جس پر تم نے اِسے چھوڑ تھا" اس شخص نے دیوانوں کی سی مُنہ پھٹ گستاخی سے جواب دیا "اس کا مجھے کیا کچھ یاد رہ گیا ہے ؛ کچھ بھی نہیں۔ سوائے اِذا جاء نصر اللہ کے" لوگ اس کی باتوں پر ہنستے تھے اور ہم خدا سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اس پر اور سب مسلمانوں پر رحم کرے۔ دمشقی حجام نے مجھے بتایا کہ وہ آخر تک اسی حالت میں رہا۔ حتیٰ کہ موت نے اُسے اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا۔"

صوفیوں کی خانقاہیں (خوانیق) گویا پُر تکلف زیبائش اور آرائش سے سجے ہوئے محل تھیں۔ جن کے ہر گوشے تک پانی بہتا تھا۔ صوفیوں کے اس طائفہ کے رُکن متموّل اور دولت مند لوگ ہوتے تھے۔

"کیوں کہ خدا نے اُنھیں دُنیا کے اسباب و کرامات سے مالا مال کر رکھا ہے

اور اُنھیں فکرِ معاش سے آزادی دی ہے تاکہ وہ دل و جان سے اُس کی بندگی کریں۔ اس نے انھیں رہنے کے لیے ایسے قصر دیے ہیں جو انھیں جنّت کے قصروں کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ یہ صوفی خدا کی مہربانی سے دونوں جہانوں کی لذّت سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ ایک نیک راستہ پر چلتے ہیں اور ان کے آداب قابلِ تعریف ہیں۔ عبادت میں ان کا طریقہ عجیب ہے اور ان کا جذباتی موسیقی کو سننے کے لیے اکٹھا ہونے کی عادت عمدہ ہے۔ اس وجدانی اور کھوئی ہوئی حالتوں میں بعض صوفی تو اس دنیا سے چل بستے ہیں۔"

صوفیوں کے متعلق ابنِ جُبیر کی یہ تعریف حیران کن ہے۔ یہ واضح ہے کہ صوفی کاہل لوگ ہوتے تھے۔ فری میسنری کی قسم کی جماعت ان کی ہوتی تھی۔

"شہر میں ایک اجنبی کے لیے سہولتوں کا شمار نہیں۔ خصوصاً ان غیر ملکیوں کے لیے جو حافظِ قرآن ہیں یا مطالعہ کے شوقین ہیں۔ اس شہر کی مہمان نوازی غیر معمولی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ مغرب کے ان نوجوانوں میں سے جو کوئی خوشحالی کا خواہش مند ہو اور وہ علم کے کھوج میں اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں آ جاتے تو اسے یہاں ہر قسم کی سہولت رہے گی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ فکرِ معاش سے چھٹکارا پا جائے گا۔ اور یہ علم کے حصول کے لیے بڑا ضروری ہے۔ جب شوق ہو اور دوسرے جھنجھٹ نہ ہوں تو طالب علم اپنی پوری کوشش کے لیے راستہ صاف پائے گا۔ اور کسی کے لیے پھسڈی رہ جانے کا کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ ماسوائے ان کے جو کاہلی اور ٹال مٹول کے شکار ہیں اور میرا یہ مشورہ اُن کے لیے نہیں ہے۔ ہم صرف تلاش و امنگ والوں سے مخاطب ہیں جو یہ دیکھیں کہ روزی کے تردّدات ان کے علم کی تلاش کے مقصد میں حائل ہوتے ہیں۔ تو پھر مشرق کا دروازہ ان کے لیے کھُلا ہوا ہے۔ اس لیے اسے جفاکش نوجوان اس میں امن

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے ساتھ اندر داخل ہو جاؤ اور یکسوئی سے مطالعہ کرنے کے لیے حکومت کے دیے ہوئے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو بیشتر اسس کے کہ ایک بیوی اور چند بچے تمھارے ساتھ چمٹ جائیں اور تم گئے وقت پر غصے میں دانت پیستے رہ جاؤ۔ خدا مددگار اور رہبر ہے۔ میں نے اُن کو مشورہ دیا ہے جو سُن رہے ہیں۔ اور اُن کو آواز دی ہے جن کو جواب دیتے سُنتا ہوں۔ وہ جسے خدائی ہدایت ہو صحیح راستے پر ہے

..... ان سب مشرقی علاقوں میں مَیں نے لوگوں میں اجنبی اور تنگدست کے ساتھ فیاضی کا ہی سلوک دیکھا ہے۔ خاص طور پر اس معاملے میں دیہات کے لوگ تو بڑھے چڑھے ہوئے ہیں — ان خطوں میں کوئی بھی اجنبی جس کی اُفتاد میں فکر اور تنہائی کی تمنا ہو، اگر چاہے تو کوئی ٹکڑا زمین کا یا کھیت حاصل کر سکتا ہے اور اس پُر مطمئن ترین دل کے ساتھ نہایت خوش گوار زندگی بسر کر سکتا ہے (ہم میں سے ہر ایک کی ناقابلِ حصول خواہش!) کھیت کے لوگ پیٹ بھر کے دو وقت کی روٹی دیں گے اور وہ خود کو کسی امامی یا معلمی کے کام میں لگا سکتا ہے جب اس کا جی اس جگہ سے سیر ہو جائے تو وہ کمر کس کے بآسانی کسی اور کھیت پر جا سکتا ہے یا لبنان اور جودی کے کہساروں پر چڑھ جائے جہاں وہ کھنوں کے اندران ولی صفت درویشوں کو پائے گا جو سوائے خدائے عزّ وجل کی خوشنودی اور کسی شے کے طالب نہیں۔ جتنی دیر وہ چاہے ان کی صحبت میں رہے اور پھر وہ کہیں اور جا سکتا ہے۔ یہ عجیب ہے کہ لبنان کے کہساروں کے آس پاس کے عیسائی جب مسلمان راہبوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے لیے کھانا لے کر آتے ہیں۔ اور ان کے لیے محبت اور عقیدت کی آنکھیں بچھاتے

ہیں کہ اُنھوں نے اپنی زندگی خدائے عزّ وجل کو منسوب کر دی ہے اور اگر عیسائی اپنے مذہب کے دشمنوں سے یہ برتاؤ کرتے ہیں۔ تو تم اسس سلوک کا خود ہی تصور کر لو جو مسلمان ایک دوسرے سے کرتے ہوں گے۔"

تم جانو علم و معرفت کا حصول ہمارے اُندلسی سیاح کے لیے ایک بڑا سنجیدہ کام ہے۔ جس کے لیے لگاتار مشقت اور جستجو اور دربدر پھرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف مدرسے یا کالج میں بیٹھے بٹھائے حاصل نہیں ہو سکتا۔ طالب علم کے دماغ میں سوائے سیکھنے کے اور کوئی خیال نہیں ہونا چاہیے اور پیہم وہ اسی دُھن میں سرگرداں ہو — کھیت پر زندگی بسر کرنے کا یہ خواب، یا پھر ہاتھ میں زائر کا عصا سنبھال کر علم کی تلاش میں لمبی سڑک کی جادہ پیمائی کا خیال ہمارے اپنے حسین خوابوں اور خیالوں سے کتنا قریب ہے۔ ابن جُبیر طالب علم کی اس زندگی کے لیے تمنا کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے لیے غرناطہ کے گورنر کے سیکرٹری کی ملازمت میں عزّت اور مشاہرہ تو تھا مگر سکون نہیں تھا۔ وہ دل میں فقط ایک طالب علم تھا۔

اور آج کل علم کا مقصد علم نہیں بلکہ امتحان پاس کر کے حصولِ ملازمت یا کچھ اور۔ آج کل کوئی آدھی رات تک تیل نہیں جلاتا۔ اور کس کا حوصلہ ہے جو سو جلدوں میں' لاہور کی کہانی' لکھنے کا بیڑا اُٹھائے۔

"ایک بڑا تعجب انگیز امر جس کا لوگ ذکر کرتے ہیں۔ یہ ہے کہ اگرچہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں جنگ وجدل کی آگ بھڑکتی ہے۔ اور دونوں فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ تاہم مسلمان اور عیسائی مسافر کھلم کھلا ایک دوسرے کے شہروں میں آتے جاتے ہیں۔ اور دونوں ملکوں میں اُن سے کوئی باز پُرس نہیں ہوتی۔ اس تند جنگ کے باوجود مُسلمانوں کے قافلے مصر اور دمشق کے درمیان فرنگی مقبوضہ علاقے میں سے بلا روک ٹوک گزرتے ہیں اور پھر دمشق سے لے کر عکہ کی فرنگی بندرگاہ تک اکثر سفر کرتے

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہیں۔ اسی طرح اسلامی خطّوں میں عیسائی مسافر اور سوداگر نہیں روکے جاتے۔ عیسائی اپنے ملک میں رہنے والے مسلمانوں پر جزیہ لگاتے ہیں جو ان کو پورے طور پر امان دیتا ہے اور اسی طرح مسلمانوں علاقوں میں عیسائی تاجر جزیہ ادا کرتے ہیں۔ سپاہی جنگ کرتے ہیں مگر لوگوں کے مابین صُلح ہے۔ اور مُلک اس کا ہو جاتا ہے جو میدانِ جنگ میں فتح پاتا ہے۔"

یہ یقیناً بڑی حیران کن بات تھی، تاریخ کا ایک عجیب تضاد! اُس بڑے آدمی اور بادشاہ صلاح الدین ایوبی کی رواداری، اور دریا دلی ہی نے یہ انوکھی صورت حالات پیدا کر دی تھی جس پر اِس زمانہ میں یقین کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ آج کل تو اُن ملکوں میں بھی جن کے درمیان جنگ نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ صلح اور دوستی ہوتی ہے، ایک مُلک کے معصوم لوگ دوسرے مُلک میں آزادی سے نہیں جا سکتے۔ سرحدی چوکیاں ہوتی ہیں اور خاردار آہنی تاروں کے جنگلے۔ اور پاسپورٹ کی صبر آزما پابندیاں، ڈالر پردے، آہنی پردے اور خدا جانے کیا کیا پردے پُرامن اچھے لوگوں کو آپس میں مل بیٹھنے سے روکتے ہیں۔

عیسائی اور اسلامی لشکروں میں جنگ تھی لیکن کرکٹ کے کھیل کی طرح فیئر (FAIR) جنگ۔ لوگوں کے درمیان کوئی لڑائی نہیں تھی۔

دمشق میں ایک حصار تھا جس میں سلطان صلاح الدین رہتا تھا (یعنی جب وہ اپنی جنگوں پر نہ ہوتا)۔ اس کے شہر کے باہر دو ریس کورس تھے — حریری زربفت کے گول چکر۔ سلطان یہاں کھیلنے آیا کرتا۔ اور تفریح کے لیے اپنے گھوڑے دوڑاتا۔ جن دنوں اُندلسی سیّاح وہاں تھے۔ سلطان کی عدم موجودگی میں اس کے شاہزادے وہاں تیراندازی۔ نیزہ بازی یا چوگان کی مشق کرنے کے لیے ہر روز آتے۔

ابن جُبیر نے حمام بھی گن لیے۔ دمشق میں سو حمام تھے (بغداد میں اس "محترم شیخ" کے دعویٰ کے بموجب دو ہزار تھے) اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر "محترم شیخ" کی تعداد درست

تھی تو پھر دمشقی بغدادیوں سے کم نہاتے ہوں گے اور یہ کہ بغداد کے لوگوں کا اکثر وقت حماموں میں بیٹھ کر گزرتا ہوگا۔ دمشق کے بازار دُنیا میں بہترین اور عمدہ ترین تھے۔

ایک دفعہ دارالحدیث کے بالاخانے میں بیٹھے تھے کہ ان کے ایک دمشقی دوست نے اُنھیں صوفیوں کی خانقاہ کے متعلق ایک دلچسپ حکایت سنائی جو باب اللطافیین (مٹھائی فروشوں کے دروازے) کی ڈیوڑھی میں ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ بات صوفیوں کے متعلق چلی ہوگی اور ابن جُبیر نے خانقاہ کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ پر تعجب ظاہر کیا ہوگا کہ اتنی دولت اور ساز و سامان اس میں کہاں سے آیا۔ اس پر دمشقی نے (غالباً دوزانو بیٹھے ہوئے اور الف لیلہ کے افسانہ گوؤں کے انداز میں) یہ بیان کیا۔

"اے مغربی دوستو۔ میرے آقاؤ۔ بارگاہِ عالی میں معروض کرتا ہوں کہ یہ خانقاہ جو تم دیکھتے ہو ایک زمانہ میں خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کا مکان تھا اور وہ نیک بخت جس نے اسے خریدا۔ اُسے آراستہ کیا اور بڑا مال و زر اس کے نام وقف کیا اور پھر جس نے یہ وصیت کی مجھے اس کے اندر دفن کیا جائے اور ہر جمعہ کل قرآن میری قبر پر ختم ہو اور جو کوئی بھی اس قرأت میں شریک ہو۔ ایک ریال اُسے ہدیہ ملے۔ وہ شخص ایک غیر ملکی اسمیساطی نامی تھا۔ السمیساطی اُسے یوں کہتے تھے کہ وہ سمیساط کا رہنے والا تھا۔ یہ شخص تم دونوں فاضلوں کی طرح اپنی پرہیزگاری اور درویشی کے لیے مشہور تھا۔ اب سنو کہ جب وہ السمیساطی دمشق میں آیا تو وہ ایک مفلس اور قلاش مزدور تھا۔ ایک دن اس ڈیوڑھی میں اس مکان کے پاس سے گزرتا تھا کہ اُس نے دیوار سے ٹیک لگائے ایک سیاہ فام حبشی کو دیکھا کہ بیمار و بے یار و مددگار پڑا تھا اور اس کا پُرسانِ حال کوئی نہ ہوتا تھا۔ السُمیساطی کو اس حبشی پر رحم آیا۔ اور جنت کے انعام کی اُمید میں اور خدائے عزّ وجل سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اجر حاصل کرنے کا اہل بننے کی خاطر وہ اسے کندھوں پر لاد کر اپنے گھر لے آیا۔ یہاں اُس نے اس بدنصیب کی دل و جان سے خدمت کی — جب اس کی یعنی بیمار حبشی کی موت نزدیک آئی تو اُس نے اپنے سیساطی چارہ ساز کو بلایا اور کہا —— "تو مجھ پر مہربان ہوا ہے اور ایک زرخرید غلام کی طرح میرے آگے پیچھے رہا ہے۔ تو نے میری حالت پر رحم کھایا ہے۔ پردیسی شہر میں ایک پردیسی پر۔ اس لیے میں تجھے اس کا کچھ صلہ دینا چاہتا ہوں۔ گو بڑا صلہ تو خدائے عزّوجل تجھے آنے والی زندگی میں ہی عطا فرمائے گا۔ تو سُن میں خلیفہ المعتضد عباسی کا خدمت گار تھا اور خواجہ سرا لوگ مجھے زمام الدار کہتے تھے۔ میں جاہ و ثروت کا مالک تھا۔ لیکن خلیفہ مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور مجھے نکال دیا۔ میں اس شہر میں آیا اور اس شدید مرض میں مبتلا ہو گیا۔ پھر خدا نے اپنی رحمت سے تجھے میری مدد کے لیے بھیج دیا۔ اس لیے اب میں تجھے اپنا امین مقرر کرتا ہوں اور تیرے ذمّے یہ کام سپرد کرتا ہوں کہ جب میں مر جاؤں اور تم مجھے نہلا چکو تو خدا کی برکات کے ساتھ بغداد چلے جانا۔ وہاں لوگوں سے خلیفہ کے خدمت گار صاحب الزمام کے گھر کا پتہ دریافت کرنا۔ جب تو اس کو ڈھونڈ لے تو پھر کسی نہ کسی حیلے سے اسے کرائے پر لے لینا۔ اور اس میں میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا تیری مدد کرے۔ جب تو وہاں رہنا شروع کر دے تو اس کے اندر فلاں فلاں جگہ جا کر وہاں پھاوڑے سے زمین کھودنا۔ ایک تختہ آر پار مٹی کے نیچے تجھے ملے گا۔ اس کو کھینچ لینا اور اس کے نیچے جو کچھ تجھے ملے گا وہ تیرا ہے۔ اس کو اپنے مصرف میں لے آنا اور اچھے اور خیراتی کاموں میں بھی اسے خرچ کرنا جیسا کہ اللہ تجھے ہدایت کرے اور توفیق بخشے" —— یہ کہہ کر وصیت کنندہ مر گیا اور سیساطی وصیت کو سینے میں لیے

بغداد پہنچا۔ خدا نے اس مکان کے کرایہ پر مل جانے پر اُس کی امداد کی اور اُسے اُس کے اندر بیش بہا اور کثیر خزانہ ملا۔ یہ مال و متاع اُس نے سوداگری کے تھیلوں میں بھر لیا جنھیں وہ دمشق سے ساتھ لایا اور ایک سوداگر کے بھیس میں بغداد سے رخصت ہوا۔ وہاں جا کر اُس نے یہ مکان خرید کیا جو ایک زمانے میں خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کا تھا۔ اور اسے صوفیوں کے لیے خانقاہ میں تبدیل کر دیا۔ اس نے اسے خوب سنوارا اور اس کے وقف کے لیے متعدد مکانات اور کشت زار خرید کیے تاکہ صوفی اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ ایک ریال ملنے کی وجہ سے اب غیر ملکی اور غربا ہر جمعہ یہاں بہت بڑی تعداد میں قرآن خوانی کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور اس نیک کوش سیساطی بہ ہر دُعاؤں کے نذرانے بھیجتے ہیں ..... یہ ہے حکایت اس سیساطی کی خانقاہ کی"

اس کہانی نے اُنھیں مطمئن کیا یا نہیں (کیونکہ ابن جُبیر کچھ شکی المزاج تھا) لیکن دمشقی کی یہ کہانی الف لیلہ کی کسی بھی حکایت جتنی ہوش ربا اور سبق آموز تھی۔

دمشق کے اکثر امیر یا بادشاہزادے اور متموّل سوداگر مرتے وقت اپنی جائداد کسی کالج یا پاک مزار کے نام پر وقف کر جاتے۔ اور غالباً بیشتر دمشقی اور غیر ملکی ٹورسٹ لوگوں کا گزارہ انھی اوقاف پر ہوتا تھا۔

دمشق میں فاقے سے کسی شخص کا مرنا ناممکن ہوگا۔ بھوک سے لوگ تب ہی مرے ہوں گے جبکہ دمشق میں ایک دفعہ قحط پڑا تھا اور شاعر کے الفاظ میں لوگ عشق تک کو فراموش کر چکے تھے۔ اس شاعر نے اس قحط کے سن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن وہ ہمارے اُن اندلسیوں کے بعد پڑا ہوگا۔ ورنہ ابن جُبیر اس کا ذکر ضرور کرتا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

جمادی آلاخر کے نئے چاند نے بھی اُندلسی حاجیوں کو دمشق میں پایا۔

دمشق میں ان کے اتنی مدت قیام کرنے کا بھید اب کھُلتا ہے۔ اُنھوں نے یہاں آتے ہی جہازی ایجنٹوں اور دوسرے سوداگروں سے جہازوں سے چلنے کے متعلق پوچھ گچھ کی ہوگی۔ عکہ سے جہازوں کے موسم خزاں کی 'سیلنگز' Sailings اکتوبر میں شروع ہوتی تھیں اور عیسائی عکہ میں جاکر جہاز کے انتظار میں دو تین مہینے بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ 'مشرق کی ملکہ' دمشق میں وقت گزارا جائے جہاں ان کے دیکھنے اور کرنے کو اتنا کچھ تھا۔ اور پھر ان کو دارالحدیث میں قیام اور طعام کے پیسے بھی جیب سے نہ دینے پڑتے تھے۔ کیونکہ اس میں ٹھہرنے والے غیر ملکی درویشوں کے لیے بھی سمیساطی جیسے کسی دریا دل نے وقف مقرر کر دیا ہوگا۔

9

مسیحی شام میں

اور جمعرات کے روز کہ جمادی الاخریٰ کے بابرکت مہینے کا پانچواں دن ہے اور ستمبر کی تیرھویں تاریخ۔ اے میرے مولائیو اور سیدو! ہم آخر اپنے خچروں پر بیٹھے دمشق کے مشرقی دروازے میں سے ٹخ ٹخ کرتے باہر نکلتے ہیں (دیکھیں کہ خچر اڑیل ہیں!) اور عکہ اور سمندر کی سڑک پر ہو لیتے ہیں۔ عکہ جاتے ہوتے سوداگروں کا ایک بڑا قافلہ ہمارے ساتھ ہے۔ قیمتی جبتوں میں توندیل اور خوش حال اور نرم زبان لوگ جن میں سے ہر ایک ہزاروں کی آسامی ہے اور جن کے سوداگری کے مال سے لدے ہوئے حیوان اتنی دولت لے جاتے ہیں کہ جو ایک بادشاہ کی رہائی کے فدیہ کے لیے کافی ہے ......

وہ تھوڑی دُور ہی سڑک پر گئے ہوں گے کہ اِکّا دُکّا زرہ پوش سپاہی یا سوار اُنھیں شہر کی سمت آتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ چاندی اور سونے کے ظروف۔ اور عورتوں کے زیورات اور مختلف چیزوں کو بغل میں دبائے یا سر پر رکھے! بعض کے پیچھے پیچھے سامان اور فرنیچر اور قالین اُٹھائے غلام تھے اور کئی سپاہی، گلہ بان بنے مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کو ہنکائے چلے آتے تھے، اپنی برچھیوں یا تلواروں سے چرواہے کی لاٹھی کا کام لیتے ہوئے۔ اُنھوں نے ایک خود پوش چھوٹے قد کے پیادے سے پوچھا (جس نے ایک منقش مرتبان اپنے سر پر

toobaa-elibrary.blogspot.com

اُٹھا رکھا تھا۔ اور دھونکنی کی طرح ہانپ رہا تھا) کہ یہ کیا بات ہے؟

"بات کیا ہے۔ ہا!" پیادے نے کچھ تندی سے کہا "مجھے پہلے کچھ پانی پلاؤ۔ اور پھر میں تمھیں بتاتا ہوں کہ بات کیا ہے۔ ہم نے عیسائیوں پر بڑی فتح پائی ہے۔"

اُنھیں اُس پیادے سے پتہ چلا کہ سلطان صلاح الدین ناگہانی نابلوس پر آموجود ہوا جہاں عیسائی اُس کے پہنچنے کے متوقع ہی نہ تھے مسلمان دلاوروں نے حملہ کرکے نابلوس اور اس کے اردگرد کی قلعہ بند جگہوں اور بستیوں پر قبضہ کرلیا۔ فاتح سلطان نے فوج کو حکم دیا کہ جس کے ہاتھ میں جو مالِ غنیمت لگے اُس کو لے جانے کی اجازت ہے۔ میں نے صرف اس مرتبان پر اکتفا کی ہے۔ ہم نے ہزاروں قیدی پکڑے ہیں۔ تم ابھی ان کو دیکھو گے۔"

پیادے کے کہنے کے مطابق تھوڑی دیر سڑک ہزاروں فرنگی قیدیوں سے پٹی پڑی تھی جنھیں سلطان کے سپاہی سنانوں اور چھڑیوں سے ہانکتے چلے آتے تھے۔

یہ ایک بڑی اسلامی فتح تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مسلمان سوداگر اس وقت فرنگی علاقے کو جا رہے تھے جب کہ فرنگی قیدی اسلامی خطّوں میں داخل ہو رہے تھے اور فرنگیوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں شرمناک اور زبردست شکست اُٹھائی تھی۔

(ان کی دمشق سے روانگی کے چوتھے دن سلطان بھی دمشق میں لوٹ آیا۔ اور اُنھیں کسی نے بتایا کہ وہاں وہ اپنے سپاہیوں کو آرام دینے کے بعد پھر کرک کے قلعہ کے محاصرے پر واپس چلا جائے گا)

سنیچر کو وہ بانیاس کے شہر میں داخل ہوئے جو اسلامی علاقوں کی سرحد پر تھا۔ بانیاس ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کے قلعے کی دیواروں کے نیچے ایک دریا بل کھاتا ہوا شہر کے ایک دروازے کی طرف بہتا تھا۔ (ابنِ جُبیر! یہ ذرا واضح نہیں!) دریا سے ایک نہر بڑی چکیوں کو گھماتی تھی۔ مُلحقہ وادی میں وسیع کھیتی باڑی تھی اور بانیاس سے تین فرسنگ پر فرنگیوں کا سرحدی قلعہ تُبنین تھا۔

"وادی کی پیداوار فرنگیوں اور مسلمانوں میں آدھی آدھی تقسیم ہوتی ہے اور اس وادی میں ایک گڑے ہوئے پتھروں کی حدبندی ہے۔ جسے 'تقسیم کی حدبندی' کہتے ہیں وہ فصلوں کو برابر برابر بانٹتے ہیں اور اُن کے مویشی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چرتے ہیں لیکن اس معاملے میں ان کے درمیان کبھی کوئی شر نہیں اُٹھاتا۔ ہم شام کو بانیاس سے المتیہ جانے کے لیے رخصت ہوئے جو فرنگی علاقے میں ہے۔ رات ہم نے المتیہ میں گزاری اور دوسری صبح ایک بلوطوں سے ڈھپتی ہوئی وادی میں سے سفر کرتے ہوئے ہم فرنگیوں کے سب سے محکم قلعے تبنین پر آئے۔ اس جگہ قافلوں سے محصول وصول کیا جاتا ہے۔ یہ اُس سُورنی کا قلعہ ہے جسے اہلِ فرنگ ملکہ کہتے ہیں اور جو اس سُور کی ماں ہے جو عکّہ کا فرمانروا ہے۔ (خدا عکّہ کو نیست و نابود کرے)"

لیکن ابنِ جُبیر ابھی یہ دُعا نہ مانگو ابھی تم کو وہاں پہنچ کر جہاز میں سوار ہونا ہے۔ اور اگر عکّہ نیست و نابود ہوگیا تو تمھیں وہاں جہاز کیسے ملے گا۔

"ہم اس قلعے کے دامن میں خیمہ زن ہوئے۔ پورا محصول ہم سے اینٹھا گیا۔ یعنی ایک نفر سے ایک دینار اور ایک قیراط دینار ($\frac{1}{24}$)۔ تقریباً سات سو روپے! سوداگروں کے مالِ سوداگری پر محصول نہ لگایا گیا کیونکہ وہ اس ملعون بادشاہ کی جگہ عکّہ کو جاتے تھے جہاں ٹیکس جمع کیا جاتا ہے۔ عکّہ میں ٹیکس ایک دینار کی قیمت کے مال پر ایک قیراط ہے۔ مغربیوں سے تو یہ دینار کا محصول وصول کرکے ہی چھوڑا جاتا ہے۔ البتہ دوسرے مسلمان اس سے آزاد ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ 'مغربی لوگ' فرنگیوں کی جھنجھلاہٹ کا باعث ہوئے تھے اور ان کی ایک بہادر بٹالین نے نورالدین کے ساتھ مل کر فرنگیوں کے ایک قلعے پر حملہ کیا تھا اور اس کو سر کرکے اچھے مال دار اور مشہور ہوگئے

toobaa-elibrary.blogspot.com

تھے۔ چنانچہ فرنگیوں نے یہ ٹیکس مغربیوں پر بطور سزا کے عاید کیا۔ یہ دینار ہر ایک مغربی گویا ان کے ملک سے اپنی دشمنی کی پاداش میں ادا کرتا تھا۔ فرنگی کہتے تھے "یہ مغربی لوگ ہمارے ملک میں آئے اور گئے اور ہم نے ہمیشہ ان سے اچھا سلوک کیا اور ان سے کبھی کچھ نہ لیا۔ لیکن جب اُنھوں نے اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ میں دخل دیا تو ہم ان پر ٹیکس لگانے کے لیے مجبور ہو گئے"۔ اس ٹیکس کو ادا کرتے وقت البتہ مغربیوں کو اپنے دشمنوں کی جھنجلاہٹ[۱] دلربا ہی اور اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور اس سے انھیں ایک گونہ خوشی پہنچتی ہے۔ اس طرح اس کی ادائیگی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور اس کی سختی قابلِ برداشت بن جاتی ہے۔

ہم تبنین (خدا اسے ملیا میٹ کرے) سے سوموار کو پو پھٹے چل پڑے۔ ہمارا راستہ غیر منقسم کشت زاروں اور منظم آبادیوں میں سے ہو کر جاتا تھا جن کے باشندے سب مسلمان ہیں اور فرنگیوں سے مل جل کر مزے اور آرام سے رہتے ہیں (خدا ہمیں اس ترغیب سے محفوظ رکھے) وہ اپنی آدھی فصل کٹائی کے وقت فرنگیوں کو دے دیتے ہیں اور فی کس ایک دینار اور پانچ قیراط کا جزیہ ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماسوا پھلوں پر ایک معمولی ٹیکس کے انھیں اور کچھ نہیں دینا ہوتا۔ ان کے گھر اور ان کا سامان سب کا سب ان کے ہاتھوں میں رہنے دیا جاتا ہے۔ فرنگیوں کے سب مقبوضہ ساحلی شہر اسی طریق پر منظم ہیں۔ اور سب دیہاتی ضلعے، گاؤں اور کھیت بھی جو مسلمانوں کی ملکیت ہیں۔ لیکن ان مسلمانوں کے دل اس معاملے میں ریجھ چکے ہیں کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ مسلم گورنروں کے نیچے اسلامی خطوں میں ان کے بھائی اس عیش و آرام سے ناآشنا ہیں جو فرنگیوں کے تلے ان

کو میسر ہے۔ یہ اُن بدبختیوں میں سے ایک ہے جس کے آج کل مسلمان شکار ہیں۔ مسلمان اپنے ہم مذہب جاگیردار کی ناانصافی پر تو چیختے چلاتے ہیں اور اپنے مخالف اور دشمن فرنگی جاگیردار کے چلن کو سراہتے ہیں جس سے اُنھیں انصاف مل جاتا ہے۔ اس حالت میں سوائے اللہ سے شکوہ کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے کتابِ پاک کی اس آیت میں کافی تسکین اور دلجوئی ہے کہ "یہ ماسوا تیری آزمائش کے کچھ نہیں۔ تو جسے چاہتا ہے اس کے سبب سے بہکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کی راہنمائی کرتا ہے"۔ (قرآن۔ سورۃ الاعراف ۷)

ابنِ جُبیر ظالم مسلمان زمینداروں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہتا اور مسلمان کاشت کاروں پر جھنجلاتا ہے کہ وہ فرنگی زمینداروں سے کیوں خوش ہیں؟۔ وہ خوش ہیں اس لیے کہ انھیں آزادی اور روٹی کی نعمتیں میسر ہیں اور کوئی اُن کی پیداوار اُن سے لوٹ کر نہیں لے جاتا۔ اپنی اس بات میں ابنِ جُبیر زندگی کے ابتدائی حقائق سے بالکل بے نیازی اور لاعلمی کا ثبوت دیتا ہے جو روش کہ ہر زمانہ میں متوسط الحال اور فارغ البال مذہبی علماء کا خاصا رہی ہے۔ اتنے بلند بانگ دعووں اور خطبوں کے باوجود ان کے دل مجبور انسان کی تڑپ سے کورے ہوتے ہیں اور اپنی خاص ذہنی افتاد کے باعث ایک عام آدمی کے نظریے سے چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ ابنِ جُبیر اُنھیں ایک جابر مسلمان لٹیرے زمیندار کے تحت فاقہ زدہ، ننگا اور بھوکا دیکھنا اس سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے کہ وہ ایک عیسائی فرنگی منصف مزاج زمیندار کی عملداری میں خوش حال اور کھاتے پیتے زندگی بسر کریں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غرناطہ کے گورنر کا سیکرٹری امیر آدمیوں سے کس قدر محبت کرتا ہے اور کس طرح ان کی امارت اور جاہ و حشم کے صلے میں ان کے سب عیوب اور چیرہ دستیاں معاف کرنے کو طیار نظر آتا ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتا کہ یہ امارت انھیں کیسے ہاتھ آئی اور معصومیت کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہے کہ امیر غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسی شام کو ایک کشت زار کے مُسلمان اور سیٹر نے قافلے والوں کو اپنے گھر کے ایک بڑے کمرے میں پارٹی دی۔ اور بڑی مہمان نوازی سے کئی قسم کے کھانے ان کے سامنے چُنے۔ اُنھوں نے ایک رات وہاں بسر کی اور منگل کی صبح کو (جب جمادی الآخریٰ کی دسویں اور انگریزی مہینے ستمبر کی اٹھارہ تاریخ تھی) بندرگاہ پر پہنچے۔

" ہمیں کسٹم ہاؤس میں لے جایا گیا جو قافلوں کو ٹھہرانے کے لیے بنایا ہوا ایک مسافر خانہ ہے۔ دروازے کے باہر پتھر کے بنچ ہیں جن پر قالین بچھے ہیں۔ کسٹم کے عیسائی کلرک اپنے سونے سے مڑھے ہاتھی دانت کے قلمدانوں کے ساتھ وہاں بیٹھتے ہیں۔ وہ عربی میں لکھتے ہیں اور گفتگو بھی عربی میں کرتے ہیں۔ ان کا افسر صاحبِ دیوان کہلاتا ہے جس کے پاس کسٹم کو چلانے کا ٹھیکہ ہے۔ اسے سب کلرک الصاحب' اور 'با صاحب' اُس کے عہدے کی وجہ سے کہتے ہیں ـــ یہ ایک لقب ہے جسے یہ ملٹری والوں کے علاوہ سب باعزّت سویلین، عہدیداروں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سب جمع شدہ محاصل اس کلکٹر آف کسٹم کو جاتے ہیں جو حکومت کو ایک بڑی رقم ادا کرتا ہے۔ سوداگروں نے اپنا سامان کسٹم ہاؤس کے سامنے جما دیا اور بالائی منزل پر فروکش ہو گئے۔ اُن لوگوں کے ذاتی اسباب کا بھی جن کے پاس مالِ سوداگری نہ تھا معائنہ کیا جاتا کہ کہیں اُنھوں نے کوئی قابلِ محصول چیز نہ چھپا رکھی ہو۔ جس کے بعد اُنھیں جانے کی اجازت دے دی جاتی۔ یہ سب کچھ بڑی شائستگی اور خوش اخلاقی سے ہوا اور کسی سختی یا ناانصافی کے بغیر۔ ہم سمندر کے پاس ایک گھر میں فروکش ہو گئے۔ جسے ہم نے ایک عیسائی عورت سے کرائے پر لیا اور خدائے عزّوجل سے دُعا مانگتے تھے کہ وہ ہمیں سب خطروں سے بچائے اور

سلامتی سے رکھے "

کسٹم کے وقت ابنِ جبیر اور احمد ابن حسّان کو اسکندریہ کی کسٹمز بھی یاد آئی ہوں گی ـــــ وہاں کے عمّال اور منشیوں کی درشتی طمع اور لوٹ کھسوٹ۔ اُن کے دل میں یہ خیال تو آیا ہوگا کہ یہ عیسائی سُور اتنے بُرے تو نہیں۔ اور وہ ایک آدمی کو اُس کے مرتبہ و مقام کے مناسب عزّت دیتے ہیں۔ آدمی سوچتا ہے کہ کیا کپلنگ درست تھا جب اس نے کہا کہ مشرق مشرق ہے۔ مغرب مغرب اور دونوں کبھی نہیں ملیں گے۔ اسکندریہ اور عکہ کی کسٹمز میں جو فرق تھا وہ آج کل بھی بمبئی یا کراچی کی کسٹمز اور کسی مغربی ملک کی کسٹمز میں موجود ہے۔ بمبئی یا کراچی میں کسٹمز کے افسر اب بھی اُسی طرح فرعونِ بے سامان ہیں جس طرح آٹھ سو سال پہلے اسکندریہ یا جدّہ کے افسرانِ محاصل تھے۔ یا کیا حالات اب کچھ بدل گئے ہیں ؟ !

لیکن وہ اب نیلے سمندر پر تھے۔ ان کے سامنے بندرگاہ کے ٹاپو میں مستولوں کا ایک جنگل تھا۔ اور مختلف قوموں کے جہاز! وہ خوش تھے۔

" عکہ" اُندلسی لکھتا ہے " شام کے فرنگی شہروں کا دارالخلافہ ہے۔ سمندر میں پہاڑوں کی طرح اُٹھے ہوئے جہازوں سے مال اُتارنے کا مقام اور ایک بندرگاہ جہاں ہر ملک کے جہاز آتے ہیں۔ اپنی عظمت میں یہ شہر قسطنطنیہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ جہازوں اور قافلوں کا مرکز، سب ملکوں کے مسلمان اور عیسائی سوداگروں کا مقامِ اجتماع ہے۔ اس کے گلی کوچے انسانوں کے ہجوم سے حبس دم رہتے ہیں یہاں تک کہ زمین پر پاؤں دھرنا مشکل ہوتا ہے شرک اور ناپارسائی کا بازار وہاں گرم ہے۔ اور سؤر (عیسائی) اور صلیبیّن کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کے بازاروں میں بدبو اور تعفّن ہے اور جا بجا

toobaa-elibrary.blogspot.com

غلاظت اور کوڑے کے ڈھیر ہیں۔ فرنگیوں نے پانچویں صدی کے آخری دس سالوں میں اسے مسلمانوں سے چھین کر اس کی عصمت دری کی۔ اور اسلام کی آنکھیں اس کے سوگ میں رونے سے سوج گئیں۔ یہ اسلام کے ڈکھڑوں میں سے ایک ہے۔ مسجدیں کلیسا بن گئیں اور مینارے گجر کے برج۔ لیکن خدا نے بڑی مسجد کا ایک حصّہ جو ایک چھوٹی سی مسجد کے طور پر مسلمانوں کے پاس رہ گیا۔ اُن کافروں کے ہاتھوں نجس ہونے سے بچا لیا۔ جہاں وہ فرض پڑھنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ اس کی محراب کے پاس صالح نبی کا مزار ہے۔ شہر کے دائیں جانب اعین البقر (مویشیوں کا چشمہ ہے) جس میں سے خدا نے آدم کے لیے مویشی نکالے۔ اس کے اُوپر ایک مسجد ہے جس کی صرف محراب ہی اپنی پہلی حالت میں برقرار ہے۔ اس کے مشرق میں فرنگیوں نے اپنی محراب تعمیر کی ہے اور مسلمان اور بُت پرست یہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک اپنی عبادت گاہ کو جاتا ہے دوسرا اپنی کو۔"

ایجنٹ نے انھیں بتایا تھا کہ ان کو جہاز طائر سے ملے گا۔ اور اس لیے وہ عکہ میں دو دن ٹھہر کے غالباً پاپیادہ سور (طائر) کو روانہ ہو گئے۔ طائر فرعون کے زمانے میں ایک مشہور بندرگاہ تھی جب فینیقی اس وقت کی دُنیا کی سب سے بڑی بحری قوم تھے۔ فرعون آمانی ہیت نے اپنے ایک جہازی کپتان کو دیودار لانے کے لیے اسی بندرگاہ پر بھیجا تھا۔ اور موسےٰ نبی کے زمانے کے فرعون رامیسس کی آمون اور حارث دیوتے کی رجمنٹیں حتیٰ مڈھی دل کو کچلتی طائر تک پہنچی تھیں۔ او طائر! تیری یہ پُرآشوب تاریخ! جب جہازی کپتان تیرے پتنوں سے اپنے جنگی بیڑوں میں نکلتے تھے اور سمندروں پر پھرتے تھے۔ اب تُو ایک چھوٹی بندرگاہ ہے۔ کسی شمار و قطار میں بھی نہیں اور تیرے بڑے دن بُھلا دیے گئے۔

وہ الزاب کے بڑے قلعے کے پاس سے گزرے جو غیر منتظم کھلیانوں اور تاکوں پر ایک قسم کے چھاتے کی طرح تھا۔ اور اسکندرونہ کا فصیل دار شہر بھی ان کی راہ میں پڑا۔ وہ اسی شام طائر

میں پہنچ گئے۔ کیونکہ عکہ اور طائر کے درمیان فاصلہ کُل تیس میل تھا۔ وہ شہر میں ایک حاجیوں کی سرائے میں جا ٹھہرے۔

"طائر اپنے ناقابلِ تسخیر ہونے کی بدولت ضرب المثل بن چکا ہے اور جو کوئی بھی اسے فتح کرنے کی کوشش کرے اسے جلا دینے اور اطاعت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ فرنگیوں نے ناگہانی واقعات پیش آنے کی صورت میں اسے اپنے لیے ایک پناہ اور اپنی سلامتی کی خاطر ایک محکم ٹھکانہ بنایا ہے۔ اس کے گلی کوچے عکّہ سے زیادہ ستھرے ہیں۔ اس کے لوگ فطرتاً عکّہ کے لوگوں سے اپنے مشرکانہ عقائد اور لادینی میں کم ضدی ہیں۔ اور طبعاً اور عادتاً مسلمان اجنبیوں سے مہربانی اور مروّت سے پیش آتے ہیں۔ ان کا انداز زیادہ ملائمت آمیز ہے۔ اس شہر میں مُسلمانوں کی حالت عکّہ سے زیادہ بہتر اور پُرچین ہے . . . . طائر کے شہر کے دو دروازے ہیں۔ ایک خشکی کی جانب دُوسرا سمندر کی جانب۔ خشکی کے دروازے تک محکم طور پر قلعہ بند بیرونی دیواروں میں سے تین چار آہنی پھاٹکوں میں سے گزر کر ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ سمندر کی طرف کے دروازے کے دونوں طرف دو محکم برج ہیں اور یہاں سے بندرگاہ پر جاتے ہیں جس کا محل وقوع بحری شہروں میں بے مثل ہے۔ تین طرف سے تو شہر کی اُونچی دیواریں اسے گھیرے ہوئے ہیں اور چوتھی طرف سمندر کے بیچوں بیچ ایک پتھریلی گودی اس کو علیحدہ کرتی ہے۔ جہاز دیواروں کے نیچے داخل ہو کر لنگر کرتے ہیں۔ دونوں برجوں کے درمیان ایک مہیب زنجیر لٹکتی ہے۔ جب اسے اُوپر اُٹھا دیا جائے تو نہ کوئی جہاز اندر داخل ہو سکتا ہے نہ باہر جا سکتا ہے۔ دروازے پر محافظ اور قابلِ اعتماد

toobaa-elibrary.blogspot.com

پہرے دار ایستادہ ہیں۔ اور ان کی نگاہ سے بچ کر کوئی اندر باہر گزرنے نہیں پاتا، اس بندرگاہ کے وقوع کی خوبصورتی، فی الواقع ناقابلِ بیان ہے۔ عکہ میں بڑے جہاز نہیں آسکتے۔ اس لیے انھیں باہر لنگر کرنا پڑتا ہے۔ طائر کی بندرگاہ اس کے برعکس زیادہ مکمل، خوبصورت اور پُر رونق ہے۔"

اُنھوں نے طائر میں سوداگر جہازوں کے مالکوں اور جہازی کپتانوں کے پیچھے اپنے جہاز کا پتا کرنے کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی۔ اگرچہ افریقہ اور روم اور اسکندریہ کی طرف کئی جہاز جانے والے تھے لیکن صرف ایک جہاز انھیں ایسا ملا جو ساحلِ اُندلس کی بندرگاہ بورقیبہ تک جا رہا تھا۔ وہ اس کے ناخدا سے شہر میں سمندری آدمیوں کی سرائے میں جا کر ملے جہاں وہ ٹھہرا۔ وہ ایک نشے میں چُور جینوائی رومی تھا۔ رومی ٹوپی اور سمندری برجس میں۔ اور اُس نے دونوں سنجیدہ اُندلسیوں کو معصوم احمقوں کا جوڑا سمجھ کر اُڑانے کی کوشش کی۔

"ہاں مغر ہو! میرا جہاز بورقیبہ جانے والا ہے۔ اور تم میرے ساتھ آسکتے ہو۔ اگر تمھارا ارادہ راستے میں ڈوبنے کا ہے۔" اُس نے ہنستے ہوئے ایک بلند آواز میں ابن جُبیر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ہا ہا۔ معلوم ہوتا ہے تم اپنے بیوی بچّوں سے محبّت نہیں کرتے۔"

ابنِ جُبیر نے جینوائی کے اس تمسخر اور اُڑانے کے انداز کو بالکل پسند نہ کیا۔ احمد ابن حسّان نے پُوچھا "کپتان! کیا تم مذاق کرتے ہو؟"

"مذاق۔ ہا۔ ہا۔ یہ جہاز راستے میں نہ ڈوبے تو میرے باپ نے مجھے نہیں جنا۔ موٹے آدمی میرے ساتھ چلو اور خود آزما لو۔" اس زندہ دل بدمعاش نے انھیں یقین دلایا۔ "میں نے جہاز کے مالک کو بتا دیا ہے کہ اس کے پیندے میں تین سوراخ ہیں مگر وہ اس کو بورقیبہ بھیجنے پر مُصر ہے اس کی مرمت پر اتنا خرچ آچکا ہے کہ وہ شاید اسے کھو دینا چاہتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ تھوڑا سا طائری شراب کا ایک ایک پیالہ پیو۔" اور اُس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے سرائے کے ساقی لڑکے کے لیے تالی بجائی۔

دونوں اُندلسی وہاں سے لاحول پڑھتے ہوئے بھاگے۔ اُنھوں نے اس جینوائی جیسا دریدہ دہن

اور گستاخ شخص کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے سے جینوائی کے قہقہے کی آواز آئی۔ وہ اُنھیں پکار رہا تھا۔ "او سنو۔ او سنو۔ میرے پچاؤ۔" اُنھوں نے پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ اور اپنی قیام گاہ میں آکر فیصلہ کر لیا کہ وہ اس جینوائی کے جہاز میں کبھی نہیں جائیں گے۔ انھیں اپنی جانیں عزیز تھیں اور وہ غیر ضروری خطرہ مُول نہیں لینا چاہتے تھے۔ پھر جینوائی بہت زیادہ بے ادب اور مُنہ پھٹ بھی تو تھا۔

پھر اُنھیں پتہ لگا کہ ایک بڑا جہاز عکہ سے جزائر سسلی کو جانے والا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جینوائی کے جہاز میں جانے سے بہتر ہے کہ وہ اس بڑے اور مضبوط جہاز میں سسلی چلے جائیں اور پھر وہاں سے اندلس جانے والے کسی دوسرے جہاز میں جگہ لیں۔

طائر میں یہ بھاگ دوڑ کرتے ان کو گیارہ دن لگ گئے۔ ایک دن اُنھوں نے ایک ورغلانے والا شادی کا جلوس بندرگاہ کے پاس دیکھا جہاں وہ جہازوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اکثر جایا کرتے تھے۔ یہ نظارہ اُندلسی کو ہی بتانے دو۔ اپنے ناقابلِ تقلید انداز میں۔

"سب عیسائی۔ مرد اور عورتیں اکٹھے ہوئے ہوئے تھے۔ اور دُولھن کی چوکھٹ کے باہر دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ قرنا، طنبورے، بربط اور دوسرے غنائی آلے دیر تک نغمہ پرواز رہے۔ یہاں تک کہ وہ دو آدمیوں کے درمیان غرور سے باہر نکلی جو اسے دائیں اور بائیں بازو سے سہارا دیے ہوئے تھے جیسے کہ وہ اس کے قرابتی ہوں۔ وہ ایک خوبصورت پوشاک میں بڑی نفاست سے ملبوس تھی۔ اور زریں حریر کا لمبا بڑھا ہُوا حصّہ ان کے رواج کے مطابق اس کے پیچھے گھسٹتا تھا۔ اپنے سر پر وہ زرتار جالی سے ڈھنپا ہوا ایک سنہری نیم تاج پہنے تھی۔ اور اس قسم کا پہناوا اس کی چھاتیوں پر تھا۔ اپنے گہنوں اور پوشاک میں مغرور، وہ ایک فاختہ کی طرح یا بدلی کے ایک ننھّے پرت کے انداز میں چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی تھی۔ خدا ہمیں (یعنی ابن جُبیر۔ احمد ابن حسّان اور دوسرے مسلمانوں کو) اس نظارے کی ورغلاہٹ سے محفوظ رکھے (لیکن ابنِ جُبیر تمھارے

toobaa-elibrary.blogspot.com

لیے اسے دیکھنا ضرور تھا ؟) اس کے آگے نہایت بیش قیمت اور عمدہ پوشاکوں میں اپنے فرغلوں کو پیچھے گھسٹتے عیسائی امیر چلتے تھے اور جلو میں اپنے بیش بہا لباسوں میں ملبوس اور اپنے ازحد نفیس زیورات میں اتراتی دلہن کی ہم جلیسیں اور سہیلیاں تھیں۔ سب کے پیش میں آلاتِ موسیقی بجانے والے تھے، باجے والے بربط نواز وغیرہ۔ مسلمان اور دوسرے عیسائی نظارہ کن راستے پر دونوں طرف کھڑے تھے اور اُنھیں خوب غور سے بغیر کسی ملامت کے تکتے تھے۔ اس انداز میں چلتے چلتے وہ دُلہن کو دُولھا کے گھر پر لائے اور سارا دن شادی کا جشن مناتے رہے۔ اس طرح ہمیں اس نظارے کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ جس کی ترغیب دہی اور بہکاوے سے خدا ہمیں مامون رکھے۔"

دیندار ابنِ جُبیر کو حیرانی ہوتی ہے کہ اس نظارے کو دیکھنے والوں کی آنکھوں میں اس بے حیائی اور بے پردگی کے جلوس پر ملامت کا شائبہ تک نہ تھا مگر عیسائیت پہلے پہل روما میں پھیلی تھی۔ اور قدیم رومن بڑے شوقین مزاج، عیاش اور ہمارے مشرقی معیار سے بے شرم لوگ تھے۔ یہ شادی کا جلوس جو ابن جُبیر اور اس کے طبیب دوست نے دیکھا تھا۔ غالباً کسی مشہور فرانسیسی نائٹ Knight کا ہوگا جو پوپ کے فرمان پر یہاں پاک سرزمین میں، ملحد سلادین سے لڑنے آیا ہوگا اور دُلہن کسی بڑے فرنگی امیر یا سوداگر کی بیٹی ہوگی۔ طائر میں غریب عیسائی بھی بہت سے تھے اور بیشمار مفلس نائٹ Knight جن کے پاس اپنا گھوڑا اور اپنا خدمت گار لڑکا بھی نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً ان کی شادیاں اس نمائش اور بھڑک سے نہ ہوتی ہوں گی۔

طائر میں وہ پیسے بچانے کے خیال سے ایک مسجد میں ٹھہرے جو ابھی تک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ طائر کے ایک مسلمان بوڑھے نے اُنھیں بتایا کہ یہ شہر مسلمانوں سے ۵۱۸ھ (۱۱۲۴ء) کو چھینا گیا۔ عکّہ پر نصرانیوں نے بیس سال پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا۔" یہ ایک بڑا لمبا محاصرہ تھا۔" بوڑھے نے کہا "عیسائیوں نے خشکی اور سمندر کے سب راستے مومنوں پر بند کر دیے۔ مومنوں کے گیریزن نے ہتھیار تب ڈالے جب

وہ بھوک سے مغلوب ہو گئے۔ بھُوک۔ صرف بھُوک نے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بیوی بچّوں کو جامع مسجد میں اکٹھا کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیں گے تاکہ وہ سُوروں کے نجس ہاتھوں میں نہ پڑیں اور وہ خود کفن باندھ شہر سے باہر عیسائی لشکر پر آخری ہلّہ بول کر اکٹھے شہید ہو جائیں گے۔ لیکن خدا نے اپنا اٹل حکم دیا۔ اور ان کے بعض محدثوں اور باخدا لوگوں نے انھیں ایسا کرنے سے روکا۔ اُنھوں نے پھر شہر کو خالی کرنے اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ کئی ان میں سے بھاگ نکلے۔ مجھ جیسے۔ میں اس گیریزن میں سارجنٹ تھا۔ اور ہم مسلمان ملکوں میں پھیل گئے۔ میں دمشق میں چلا گیا۔ اور ایک مدّت تک وہاں ایک تاجر کا گماشتہ رہا۔ آخر وطن کی محبّت نے مجبور کیا اور پانچ سال ہوئے میں طائر میں ہوں۔ خدا ہمیں معاف کرے۔"

ابنِ جُبیر نے کہا:

"تم اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر پھر کیوں ملحد کافر کی حکومت میں چلے آئے۔ بڑے میاں! جب اسلامی ملکوں کا راستہ کُھلا ہو تو خدا کی نگاہوں میں کسی مسلمان کے لیے کوئی عُذر نہیں، کہ وہ ایک کافر ملک میں رہے۔"

بوڑھے نے کہا:

"بے شک مغربیو! تم سچ کہتے ہو۔ اور خدا مجھے معاف کرے گا۔ مگر وطن کی پکار میرے لیے ناقابل مزاحمت تھی۔ اور کوئی چیز کشاں کشاں مجھے ان گلی کوچوں میں پھر لے آئی۔ اب میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ اور اُمیدوار ہوں کہ میری بوڑھی ہڈیاں اسی خاک میں آرام کریں۔"

ابن جُبیر کو اس بوڑھے نے قائل نہ کیا۔ وہ کہتا ہے۔

"خبردار! خبردار ان کے ملکوں میں کبھی داخل نہ ہو۔ ان میں مت رہو۔ تم اپنی تکلیفوں اور دہشت ناکیوں اور ایسی ذلّت اور ادبار سے دوچار رہو گے کہ سُن کر کلیجہ مُنہ کو آئے گا۔ تمھیں کمتر اور گھٹیا سمجھا جائے گا۔ ان ملکوں میں ایک تو صفائی اور طہارت

toobaa-elibrary.blogspot.com

نہیں رہ سکتی۔ بوجہ ان سوروں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے۔ خبردار! خبردار! خدا ہم مسلمانوں کو اس قصور کے لیے معاف کرے جس میں ہمارے پاؤں بہک کر ہمیں لے آئے ہیں۔"

ایک دن اُنھوں نے فصیل پر مسلمان مرد اور عورت قیدیوں کو بیڑیاں پہنے غلاموں کی طرح کام کرتے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں یہ ذلّت دیکھ کر آنسو اُمڈ آئے اور ان کے دل پھٹ گئے۔ ایک فرنگی اوورسیئر نے جو ایک کوڑا لیے ان کے کام پر نگرانی کر رہا تھا، دونوں مغربیوں کو جھڑکا۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔ ملحدو۔ آگے اپنا راستہ پکڑو۔ تمہارے کھڑے ہونے سے قیدیوں کی توجّہ بٹتی ہے۔"

فرنگی شام میں یہ قیدی عموماً زرِ رستگاری کی ادائیگی پر رہا بھی کر دیے جاتے تھے۔ شام اور دوسرے علاقوں کے متموّل مسلمان عموماً مرتے وقت یہ وصیّت کر جاتے کہ ان کی جائیداد کا اتنا حصّہ بیچارے مغربیوں کو چھڑانے میں صرف کیا جائے۔ دمشق کے دو بڑے امیر سوداگر ابوالدّر یاقوت اور نصر بن قوام کہ بلا شرکتِ غیرے فرنگی ساحل کی کل تجارت ان دونوں کے ہاتھ میں تھی 'مغربی' قیدیوں اور غلاموں کی رہائی پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے تھے۔ ان کے قافلے ان کے مالِ سوداگری کے ساتھ دمشق اور فرنگی شام کے درمیان آتے جاتے ہیں۔ ان کا اثر و رسوخ عیسائی امراء اور پادشاہزادوں پر بہت کافی تھا۔

"کوئی مغربی ان کی مدد کے بغیر اسیری سے نہیں چھوٹ سکتا۔ اور بڑے عرصے تک وہ خدا کے خادموں کو اس کے دشمن ملحد کافروں کے چنگل سے چھڑانے میں اپنی دولت بے دریغ خرچ کرتے رہے ہیں۔ . . . . لیکن سوء اتفاق سے دمشق سے عکّہ آتے ہوئے ہمارا ہم رکاب ایک مغربی تھا۔ بجایہ (ہسپانیہ) کے علاقہ کا رہنے والا جو پہلے فرنگیوں کا اسیر تھا، لیکن ابوالدّر کے توسّط سے رہا ہو گیا۔ اور اپنے کارپرداز نوجوانوں میں سوداگر نے اُسے رکھ لیا۔ عکّہ میں پہنچ کر یہ مغربی عیسائیوں

سے ملنے جلنے لگا۔ یہاں تک کہ اُن کی وضع قطع پر اُس نے خود کو ڈھال لیا۔ شیطان اسے زیادہ ہی بہکاتا گیا۔ اور آخر اُس کو اتنا گمراہ کیا کہ اُس نے اسلام کا دین ترک کر دیا۔ اور ہمارے طائر کے قیام کے دوران ہی عیسائی بن گیا۔ طائر میں ہی ہم نے سُن لیا کہ اُس کو بپتسمہ دے دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ ناپاک ہو گیا ہے۔ اُس نے ایک عیسائی خانقاہی کا پٹکا کمر میں باندھا اور کلیسا میں داخل ہو گیا — جہنّم کے شعلوں کو اپنی طرف بلاتا ہوا اور خود کو خوف ناک حساب کی زد میں لاتا ہوا۔ ہم خدائے ذیشان سے ملتمس ہیں کہ وہ ہمیں اس دُنیا اور اگلی دُنیا میں سچّی ہدایت میں راسخ کرے۔"

سوموار ۲۳ جمادی وہ پھر بذریعہ کشتی سمندر کی راہ سے عکّہ پہنچے۔ کیوں کہ سسلی جانے والا بڑا جہاز اسی بندرگاہ میں لنگر کیے تھا۔ عکّہ میں صبح کو آئے اور بندرگاہ میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے اپنا جہاز دیکھا۔ یہ ایک بڑا تین مستولوں کا جہاز تھا — اتنا بڑا کہ یہ بندرگاہ میں داخل نہیں ہو سکا تھا کشتیاں کنارے سے مالِ سوداگری کی پیٹیوں سے لدی ہوئی آتی تھیں۔ اور قوی الجثّہ جینوائی اور حبشی ملّاح ایک چرخی سے اُنھیں کشتی سے کھینچ کر جہاز کے پیٹ میں اُتارتے تھے۔

وہ شہر میں ابوالدّر دمشقی سوداگر کے ایک ایجنٹ سے ملے جس نے کچھ بھاگ دوڑ کر کے ان کے لیے اس جہاز پر نشستیں بُک کرا دیں۔ ایجنٹ نے انھیں یہ بھی اطلاع دی کہ ۲۷ تک جہاز میں مال وغیرہ لدے گا اور وہ پانی اور خورش وغیرہ کا ذخیرہ لے گا۔ اور اٹھائیس سے اس میں مسافروں کو سوار ہونے کی اجازت دے دی جائے گی۔ وہ عکّہ میں ایک مسجد میں ٹھہرے کیونکہ اس عیسائی عورت کے گھر میں جہاں وہ پہلے ٹھہرے تھے۔ اب ایک بدحال ہسپانوی نائٹ Knight نے قبضہ جمایا تھا۔ وہ روزانہ بندرگاہ پر اپنے جہاز کو دیکھنے کے لیے جاتے۔

ابن جُبیر لکھتا ہے:

"یہ سُوّر۔ عکّہ کا فرمانروا جسے یہ بادشاہ کہتے ہیں۔ تنہائی اور خلوت میں رہتا ہے اور کبھی نظر نہیں آتا۔ خدا نے اسے کوڑھ کے عارضے سے سزا دی ہے اور وہ اپنے انتقام میں [illegible] نہیں [illegible] چنانچہ یہ بادشاہ: ابھی بچہ ہے [illegible] کوڑھ [illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

پر پھیلنے لگا۔ اور وہ اسی وقت سے اس دُنیا کی مسرتوں اور لذتوں سے چھن گیا۔

وہ اس دُنیا میں بدنصیب ہے لیکن اگلے جہان کا عذاب اس سے بھی زیادہ شدید ہوگا اور زیادہ دیرپا۔ اُس کا حاجب اور ایجنٹ اس کا ماموں النفوس ہے جو خزانے کا مہتمم ہے اور ہر ایک شے پر اس کا ہاتھ ہے۔ ملعون فرنگیوں میں سب سے ملعون طرابلس اور طبریہ کا فرمانروا ہے۔ اس کا بڑا اثر اور مرتبہ ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بڑا زیرک اور مکّار ہے۔ بارہ سال یا زیادہ عرصہ وہ نورالدین کا اسیر رہا۔ اور پھر صلاح الدین ایوبی کی صوبیداری کے وقت اُس نے ایک بیش بہا رقم کی ادائیگی سے خود کو رُستگار کرایا۔ خدا یہ عکّہ کا شہر مسلمانوں کو بحال کردے۔"

[چھ سال کے بعد عکّہ پھر مسلمانوں کے پاس تھا۔ گو فرنگی، فرانسیسی اور جرمن نائٹوں کے لشکروں کے آنے پر پھر اس شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ اور آخر بہادر گیریزن کو پھر ہتھیار ڈالنے پڑے کیوں کہ شہر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ صلیبیوں نے گیریزن کے کئی بہادروں کو منجنیق سے فصیل پر سے اُڑوا دیا۔ اور بعد میں عہدنامہ کا پاس نہ کرتے ہوئے کتنے ہی ہزار مسلمان قیدی مرد عورتیں اور بچے رچرڈ شیر دل نے قتل کرا دیے۔ عیسائیوں نے سلطان صلاح الدین کی رحم دلی اور فیاضی سے کبھی سبق نہ سیکھا!]

سنیچر اٹھائیس جمادی الاخریٰ چھ اکتوبر کو وہ علی الصبح ہی ایک کشتی میں جہاز پر جا پہنچے۔ اس جہاز میں فرنگی بھی بہت سے سوار ہوتے۔ عیسائی یاتری بھی جو یروشلم کی زیارت سے ہو کر لوٹتے تھے بڑی تعداد میں عرشے پر ہجوم کر آئے۔ وہ تعداد میں دو ہزار سے زیادہ تھے۔

"خدا اپنی رحمت اور مہربانی سے ہمیں ان کی صحبت سے جلد چھٹکارا دے اور ہمیں اپنے فضل و احسان سے سلامتی تک پہنچائے۔ ماسوا اُس کے کوئی معبود نہیں۔ سو بڑے اور پُرجلال خدا کی مرضی کے تحت ہم سوار ہو کر ہوا کی موافقت اور جہاز کی سنگوائی Stowing کی تکمیل کا انتظار کرنے لگے۔"

اور بارہ دن وہ بے فائدہ انتظار کرتے رہے۔ جہاز نہیں چلا۔

10

عکّہ سے سسلی اور مسینہ

منگل نو اکتوبر کو بے مثال رجب کا چاند طلوع ہوا جب کہ وہ عکّہ کی بندرگاہ میں جہاز کے عرشے پر تھے۔ بارہ دن وہ بندرگاہ میں لنگر کیے رہے کیونکہ موافق ہوا نہ اُٹھی۔ شرقی ہوا صرف بہار اور خزاں کے موسموں میں چلتی تھی، اور وہ بھی اپنی مرضی سے۔ ان موسموں کے علاوہ کسی اور موسم میں عکّہ سے سمندری سفر عام طور پر نہیں ہوتا تھا۔ سوداگروں کے جہاز بھی اپنا مال انہی دو موسموں میں لاتے تھے۔ بہار کی (SAILINGS) وسط اپریل سے مئی کے اخیر تک رہتی تھی۔ ان دنوں میں وہ بابرکت مشرقی ہوائیں چلتی رہتیں۔ خزاں کی سیلنگز پھر جا کر وسط اکتوبر میں شروع ہوتیں اور شرقی ہوا صرف پندرہ دن چلتی۔ اس کے علاوہ جہازوں کے چلنے کا کوئی مناسب وقت نہیں تھا۔ اور مغرب، سسلی، یا رومی ممالک کو جانے والے مسافران موسموں میں اس مشرقی ہوا کی اس طرح راہ دیکھتے جیسے وعدۂ محبوب کے پورا ہونے کی راہ دیکھی جاتی ہے۔

یہ باتیں انھیں جہاز کے کپتان سے معلوم ہوئیں جو جینیوا کا ایک رومی تھا اور بہت سے جہازی کپتانوں کی طرح عربی زبان بھی ٹوٹی پھوٹی بولتا تھا۔ طائر کے جہازی کپتان کے برعکس یہ رومی ایک متین، چھریرا۔ سوئی کی سی آنکھوں والا شخص تھا، اُس کے داڑھی بھی تھی۔ اور وہ دیندار اور پارسا نصرانی تھا جس نے سوائے بسنت کے دنوں کے کبھی شراب کو نہ چھُوا تھا۔ جب وہ رات کو کام سے فارغ ہوتا تو

toobaa-elibrary.blogspot.com

لالٹین کی روشنی میں اپنی انجیل کا مطالعہ ایک عالم کی طرح بڑی تندہی سے کرتا۔ ابنِ جُبیر اور احمد ابنِ حسّان سے وہ بہت جلدی گھُل مل گیا اور ان کے درمیان اکثر دوستانہ مناظرے ہونے لگے۔ اُس نے انھیں بتایا کہ جب سمندر نے اِسے پہلے پہل بُلایا تو وہ ابھی لڑکا ہی تھا۔ اس کے پہلے سفر پر اس کی والدہ نے اسے یہ انجیل اس کی حفاظت کے لیے دی تھی اور اب تیس سال سے یہ اس کے پاس تھی۔ یہ رومی اگرچہ ایک کٹّر نصرانی تھا لیکن وہ اس کو پسند کرنے لگ گئے۔

ازمنۂ وُسطیٰ میں جنیوا ایک بڑی بحری قوت تھا اور بیشتر مسافروں والے یا باربرداری کے بڑے جہاز جو روم کے سمندر میں چلتے تھے جنیوائی ساخت کے ہوتے تھے اور جنیوائی رومی ملّاحوں سے لیس۔ جنیوائی جہازی کپتانوں کی بڑی شہرت تھی اور دُوسرے خطّوں کے سوداگر بھی اپنے جہازوں کی ناخدائی کے لیے دُوسروں کے مقابلے میں انھی جنیوائیوں کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

اس سارے عرصے میں دن کو جہاز پر رہتے۔ ایک ایسا جہاز جس پر تین ہزار کے لگ بھگ مسافر تھے (یقیناً بہت بڑا جہاز ہوگا) آدمی اس کے عرشوں پر بھیڑوں کی طرح ٹھنسے ہوں گے اور انسانوں کی بُو باس۔ اُن کا شور وغل خوف ناک ہوتا ہوگا۔ ابنِ جُبیر زیادہ وقت اپنا جرنل لکھنے میں گزارتا۔ احمد ابنِ حسّان کسی تاریخ یا کسی عمارت کی تفصیل کے متعلق پوچھ گچھ کیا کرتا تاکہ اس کا ساتھی جرنل میں غلط چیز نہ لکھ دے۔ احمد ابنِ حسّان کی وقت گزاری کے مشاغل کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے مگر ازمنۂ وُسطیٰ کے لوگ جلد بور نہیں ہوتے تھے۔ بورڈم ایک نسبتاً جدید عارضہ ہے۔ بعض اوقات وہ بندرگاہ میں کسی فوجی ٹرانسپورٹ کے آنے سے بہل جاتے تھے کیونکہ فرنگی نائٹ کئی ملکوں سے یہاں 'سلادین' سے لڑنے کے لیے لگاتار آرہے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر ہمارے اُندلسیوں کے خون کیسے کھولتے ہوں گے اور وہ کیسے دل ہی دل میں اُن پر لعنتیں بھیجتے ہوں گے۔

رات کو وہ ٹانگیں سیدھی کرنے اور اس دم گھوٹنے والی فضا سے بچنے کے لیے عکّہ کے شہر میں چلے جاتے اور وہاں کے ورغلانے والے نظارے دیکھتے یا سوداگر ابوالدّرد دمشقی کے گودام پر بیٹھ کر آڑو اور انجیر کھاتے اور برف لگا ہوا شربت پیتے۔ وہ ایجنٹ کے ہاں ہی رات بسر کرتے جو ان عالم مغربیوں سے بہت متاثر

تھا۔ صبح منہ اندھیرے وہ جہاز پر پہنچ جاتے۔ بندرگاہ میں اتنے جہاز تھے کہ کئی بار اُنھیں اپنا جہاز ڈھونڈنا پڑتا۔ ان کا یہ طریقہ اُس وقت تک تو محفوظ تھا جب تک کہ جہاز کی سنگوائی .Stowing جاری تھی۔

سترہ تاریخ کی شام کو بھی وہ اسی طرح ساحل پر رات گزارنے لگے۔ اگرچہ جہاز پر مال لادا جا چکا تھا لیکن وہ دن اچھا نہیں رہا تھا اور انھیں یقین تھا کہ رات کو شرقی ہوا کے چلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اتنے محتاط آدمی اس قدر لاپروا ہو گئے۔ جب دوسرے دن وہ بندرگاہ پر پہنچے تو ان کے جہاز کا نام ونشان نہ تھا، یہ ان کے بغیر چل دیا تھا!

اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُن دونوں کا اسباب اور پیٹیاں اور ابنِ جُبیر کا جرنل جہاز کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ دونوں دوستوں نے ایک دوسرے پر الزام دَھرا۔

"مَیں نے تجھے کہا تھا احمد کہ آج رات جہاز پر ٹھہریں۔" ابنِ جُبیر نے کہا۔

"جُبیر! یہ تم نے نہیں کہا تھا، بلکہ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ جانے سے پہلے کپتان سے تصدیق کر لینی چاہیے۔" احمد ابن حسّان نے جواب دیا۔

"خیر۔ ہم نے وہ ضرب المثل بُھلا دی کہ ایک آدمی کو اپنی زین نہیں چھوڑنی چاہیے۔ اب بتاؤ کیا کریں!"

احمد ابن حسّان نے بندرگاہ پر کچھ ملاّحوں سے بات کی اور زیادہ کرایے پر ایک چار چپوؤں کی بلمی کشتی لی اور جہاز کا تعاقب کیا جسے لنگر اُٹھائے ایک گھنٹہ ہی ہُوا تھا۔ خلیج حیفہ میں تموّج تھا اور دھکتی ہوئی لہروں پر چڑھتے اور اُترتے ان کے کلیجے مُنہ کو آ آ کر رہ گئے۔ ابنِ جُبیر کہتا ہے کہ یہ سفر خطرناک تھا، مگر مجھے یقین ہے کہ کھوّیوں کے لیے یہ مذاق ہوگا۔

وہ تیز اور لگاتار چپّو چلاتے رہے۔ شام پڑ رہی تھی کہ اُنھوں نے رومی جہاز کو جا لیا۔ کیسی خوش قسمتی! کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ ایک چپوؤں کی کشتی ایک بڑے بادبانی جہاز کو اس طرح جا لے گی۔ اور جہاز پر پہنچ کر اُنھوں نے خدا کا کتنا شکر ادا کیا ہوگا۔

وہ جہاز کے عرشہ پر چڑھے تو رومی کپتان قدرے تُرشی اور سختی کے ساتھ اُن سے مخاطب ہُوا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

"کیا تمھارا عکّہ میں جانا ضروری تھا؟ اور مجھ سے تم نے مغربہو پوچھا تک نہیں؟ اب اپنے خدا کا شکر کرو۔ اور ایسی بات دوبارہ کبھی نہ کرنا۔"

وہ دو سرزنش کیے ہوتے سکول کے لڑکوں کی طرح اپنی جگہ پر جا دبکے۔

پانچ دن وہ ایک گھٹتی بڑھتی متلون مزاج ہَوا کے سامنے استواری سے چلتے گئے۔ جہاز اپنی کیل پر سیدھا تھا اور اسے کوئی زیادہ ہچکولے نہیں لگ رہے تھے اور نیلا بحرِ روم ایک شیشے کی طرح صاف و شفاف تھا۔ دن اُجلے اور چمک دار تھے اور راتیں ستاروں بھری اور وسیع۔ چھٹے دن غربی ہوا اپنی کمین گاہ سے اُٹھی اور جہاز کے ماتھے پر ضربیں لگانے لگی۔ رومی کپتان نے جو اپنی جہاز رانی کے فن میں ماہر تھا۔ دائیں اور بائیں جہاز کو موڑ کر اس مخالف ہوا سے بچنے کی کوشش کی اور ہر ترکیب لڑائی کہ جہاز اُلٹے قدموں نہ پھرے۔ سمندر پُرسکون و بے خروش تھا۔ سنیچر ۲۷ر اکتوبر کو آدھی رات کے وقت مغربی ہوا اُن پر پل پڑی۔ اپنی پوری غضبناکی اور تندی کے ساتھ! اس نے مستول کے ایک حصّے کو دو ٹکڑے کر دیا۔ اور آدھا حصّہ اپنے بادبان کے ساتھ سمندر میں جا پڑا۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ حصّہ جہاز میں نہ گرا ورنہ کئی مسافر کچلے جاتے۔ ملاح آگے بھاگے اور اُنھوں نے بڑے مستول کے بادبان کو نیچے اُتار دیا جس سے جہاز کا آگے بڑھنا رُک گیا جہاز کے ساتھ بندھی ہوئی لمبی کشتی کے لیے ملاح بلائے گئے اور وہ اِسے کھینچ کر گرے ہوئے آدھے حصّے اور بادبان کے پیچھے گئے اور انھیں نکال کر لے آئے۔ پھر وہ بڑے بادبان کو اُٹھانے لگے اور اس کے اُوپر اُنھوں نے 'دلم' لگا دیا۔

"ہم نے ایک پُرفکر رات آنکھوں میں کاٹی۔ پھر دن دمکا۔ خدائے ذیشان نے ہمیں سلامتی عطا فرمائی تھی۔ ملاح رومی کپتان کی سرکردگی میں لکڑی سے ایک اور 'سپار' تیار کرنے لگے۔ لیکن مغربی ہوا اپنی بدنہادی کے آغاز میں تھی اور ہم اُمید و بیم کی حالت میں ڈگمگا رہے تھے۔ تاہم خدائے برتر کی رحمت، اس

کی پوشیدہ عنایت اور ظاہر شفقت میں ہمارا ایمان قائم رہا۔ . . .

بدھ وار کو شرقی ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ نرم، سبک اور سوئے ہوئے سے۔ اور ہمارے حوصلے عود کر آئے کیونکہ ہمیں امید تھی کہ وہ زیادہ مستقل اور زور دار ہو جائیں گے۔ لیکن یہ ان کے آخری سانس ثابت ہوئے۔ ایک باریک کُہرا سمندر پر چھایا ہوا تھا اور اس کی موجوں میں اتنا سکون تھا کہ وہ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ (قرآن) یعنی شیشے سا ہموار ایک محل دکھائی دیتا تھا۔ چاروں طرفوں میں سانس لینے کی ہوا بھی نہ آ رہی تھی۔ اس طرح ہم پانی کی سطح پر اٹکھیلیاں کرتے رہے جو نگاہوں کو پگھلاتی ہوئی چاندی کی ایک چادر لگتا تھا، یا گویا ہم دو آسمانوں کے بیچ میں بھٹک رہے تھے۔ یہ 'ہَوا' وہ ہے جسے ملاح 'غیبنی' (حبس) کہتے ہیں۔

جمعرات یکم نومبر کی رات عیسائیوں کا تہوار تھی اور انھوں نے اسے روشن موم بتیوں کی جگمگاہٹ سے منایا۔ بڑے اور چھوٹے، مرد اور عورتیں ہاتھوں میں جلتی موم بتّیاں لیے تھے۔ ان کے پادریوں نے جہاز پر اُن کو دُعا اور عبادت پڑھائی اور پھر ایک ایک کر کے اُٹھے اور پند و موعظت کرنے لگے۔ سارا جہاز اُوپر سے نیچے تک منوّر لیمپوں سے جگمگا اُٹھا۔ اس طریق پر ہم نے رات کا بیشتر حصّہ گزارا اور جب دن نکلا تو وہی محبوس ہَوا ہمارے ساتھ تھی اور اتوار کی رات تک اسی طرح رہی۔ پھر ایک شمالی ہَوا اُٹھی اور جہاز اپنے راستے پر رواں ہوا۔ ہمارے دل شاداں ہو گئے۔ خدا کی تعریف ہو!"

شعبان کا چاند بدلیوں کی اوٹ میں چھپا رہا۔ عکہ سے چلنے کے بعد بائیس دن ان کو سمندر میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہوچکے تھے۔ بائیس دن اس پُر ہجوم انسانیت میں اور ایک جہاز کے عرشے پر! قدرتاً ہمارے سیاح خُوشی سے دُور تھے اور تھکن اور مایوسی کا شکار۔ وہ سمندر کو دیکھ دیکھ کر اُکتا چکے تھے اور بعض وقت اپنے آپ سے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگ جاتے۔ ابنِ جُبیر کبھی کبھی احمد بن حسان کو کاٹ کاٹ کھاتا اور دو دو دن وہ ایک دوسرے سے رُوٹھے رہتے۔ بعض وقت وہ ایک دوسرے کو لمبی کہانیاں سنانے لگتے جو پہلے کئی بار دہرائی جا چکی ہوتیں۔ وہ ایک دوسرے کو بیچ میں ٹوکتے "لیکن تم یہ مجھے پہلے سنا چکے ہو" وہ بورڈم کی اس منزل پر پہنچ رہے تھے جو ہمارے ڈرائینگ روم میں روز کا معمول ہے۔

لیکن بورڈم تو پھر بھی طوعاً و کرہاً برداشت ہوسکتی ہے، بھوک نہیں برداشت ہوتی۔ مسافروں کا سامانِ خورد و نوش اب ختم ہونے لگا۔ جہاز کا کوٹھا ہر قسم کی جنس سے بھرا ہوا تھا اور جو کچھ وہ خریدنا چاہتے اُنھیں جہاز کے پَرسَر (PURSER) کی دکان سے دستیاب ہوجاتا۔ روٹی، پانی، ہر قسم کے پھل پھُول، خشک و تر میوے۔ مثلاً انار، تربوز، ناشپاتی، سفرجل، جوز، کچّی اور پکّی مونگ پھلی، پیاز، لہسن، انجیر، پنیر، مچھلی اور بہت سی دوسری چیزیں۔ یہ سب کچھ اُندلسیوں نے بِکتے دیکھا۔ مگر اُنھوں نے اپنے دلوں اور بٹوؤں کو قابو میں رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ کسی اجنبی ملک میں پیسے کے بغیر ہونے کا کیا مطلب ہے اور وہ محتاط اور کفایت شعار عادات کے شخص تھے۔ طبیب نے البتہ کئی بار ابنِ جُبیر پر غذا میں پھلوں کی اہمیّت واضح کی جسے اُس نے بڑے صبر اور تحمل سے سُنا۔ اس کے باوجود خود طبیب نے بھی بھُولے سے پَرسَر کی دکان کا رُخ نہ کیا۔

بائیس دن! اور خشکی کا ابھی کوئی پتہ نہ تھا۔ پہلے دو مسلمان مسافر مرے اور انھیں سمندر میں پھینک دیا گیا۔ پھر دو عیسائیوں کی باری آئی اور وہ بھی سمندر کی گود میں دفن ہوئے۔ اس کے بعد آئے دن ایک نہ ایک چل بستا۔ ایک تو زندہ پانی میں

جاگرا اور لہریں اسے بجلی کی سی تیزی سے دُور لے گئیں۔ ابنِ جبیر نے احمد ابنِ حسان کو اپنی آخری وصیّت کرنے کی کوشش کی۔ احمد ابنِ حسان نے کہا:

"اے جبیر کے بیٹے! میں تو خود تجھے وصیّت کرنا چاہتا تھا، آؤ کسی تیسرے آدمی کو ڈھونڈیں"

جہاز کا کپتان متوفی مسلمانوں کے سامان وغیرہ کا جائز وارث بنتا — سمندر کا ایک نہ لکھا ہوا قانون، جو اس زمانے میں مروّج تھا۔

ایک صبح وہ سو کر اُٹھے تو پتوار کے آدمی نے چلّا کر کہا "زمین"!

انھوں نے دیکھا کہ سمندر میں سے نیلے پہاڑ اُبھر رہے ہیں۔ مغربی ہوا اب پھر چڑھ آئی تھی اور سستائے بغیر تندی سے جہاز کے رسّوں میں زنّاٹے بھر رہی تھی۔ پھر ہوا کبھی مشرق سے چلتی اور اچانک رُخ بدل کر مغرب سے حملہ آور ہوتی۔ ہوائیں جہاز سے کھیلتی ہوئی اسے بے بسی کی حالت میں ان پہاڑوں میں سے ایک کے پاس لے گئیں۔ جہاز نے ایک چھوٹی یاقوت کی خلیج میں لنگر ڈالا۔ رومی کپتان نے انھیں بتایا کہ یہ بازنطینی جزیروں میں سے ایک ہے اور رمّانیہ میں ایسے تین سو پچاس سے زیادہ جزیرے ہیں جو قسطنطنیہ کے شاہنشاہ کی ایمپائر میں ہیں۔ مشرقی رومی ان جزائر کے باشندوں سے اتنے ہی چوکنّے ہیں جتنے مسلمانوں یا کسی اور سے، کیونکہ حاکم اور محکوم کے درمیان قلبی صُلح و آشتی نہیں۔ دو دن وہ اس لنگرگاہ میں رہے۔ بعض یونانی جزیرے سے کپتان کی اجازت لے کر جہاز پر آئے اور مسافروں کو روٹی اور گوشت فروخت کرتے رہے۔

بُدھ وار کو وہ پھر یہاں سے چلے۔ اب اٹھائیس دن ان کو سمندر پر ہوچکے تھے۔ ان کی ٹانگیں اینٹھنے لگی تھیں اور ان کے دلوں میں خوشی کی رمق تک نہ تھی۔ جمعرات کو وہ ساحل کریٹ کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے جو تین سو میل سے زیادہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

لمبا تھا۔ سمندر متلاطم تھا اور ہوا غیر موافق، اور ہمارا سیّاح اب تسلیم و رضا کی حالت میں تھا۔

سنیچر دس شعبان، ۱۰ نومبر کو وہ کریٹ کے ساحل سے آگے نکل گئے اور ایک موافق شمالی ہوا کی مدد سے تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ ہوا جہاز میں سے سنناتی اور گرجتی تھی اور جہاز ایک بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا تھا . . . . . اور پھر سمندر میں گویا شیطان گھس گیا اور وہ بے حد پُرخروش و مضطرب ہوگیا۔ لہریں کف آلود ہو کر بلیوں اُونچی اُٹھتیں اور برف پوش پہاڑوں کی طرح جہاز پر لڑھکتی آتیں۔

چھبّیس دنوں کے اس عرصے میں اُن کے حوصلے بالکل پست ہوگئے۔ رہی سہی آس ختم ہوگئی۔ اُنھیں اس کی پروا نہ رہی کہ وہ جیتے رہیں گے یا مر جائیں گے۔ اس عذاب کے مقابلے میں موت شیریں تھی اور یہ سادہ لوح مغربی اب آپس میں آخری میٹھی نیند کی آمد کی باتیں کرنے لگے۔ بعض کہتے کہ جہاز اپنی راہ سے بھٹک کر افریقہ کے ساحل 'غرب' کی طرف نکل آیا ہے۔ دُوسرے یقین دلاتے کہ ہم قسطنطنیہ اور اس کے گرد و نواح میں پہنچ رہے۔ کوئی کہتا "اسکندریہ یہاں سے تیس میل دُور ہے۔ میں نے اس کے مینار کی روشنی کی دمک تھوڑی دیر ہوئی دیکھی ہے۔" الغرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔

ابن جُبیر اکثر یہ شعر گنگناتا رہتا:

سمندر ذائقے کا کڑوا ہے۔ آن سدھا سرکش!
خدا نہ کرے کہ مجھے اس کے سفر کی ضرورت پڑے!
کیا یہ پانی اور ہم مٹی نہیں؟
تو پھر ایک مٹی کی چیز کہاں تک سطحِ آب پر صبر کر سکتی ہے؟

کپتان نے دونوں اُندلسیوں کو ایک دن یقین دلایا کہ سِسلی کا ساحل اب نظر آیا ہی چاہتا ہے۔ مگر آدھی رات کو ہوا مغرب سے چلنے لگی اور ادھر سے ایک طوفان کو ساتھ لیتی آئی۔ اتوار کی صبح کو طوفان کی شدّت بڑھ گئی اور سمندر خوفناک پھنکارے بھرنے لگا۔ موجیں کوہسار کی طرح اُٹھتیں اور جہاز پر آ کر پاش پاش ہو جاتیں اور جہاز ایک پتلی شاخ کی طرح کانپ کانپ جاتا۔

رات آئی اور سمندر کا خروش اور بھی بڑھ گیا۔ طوفان کا غضب اب فی الواقع ہولناک ہوگیا۔ بادبان اُتار دیے گئے۔

"دنیا کی مایوسی ہم پر آ پڑی۔ ہم نے تسلیم میں زندگی کو خیرباد کہا۔ لہریں ہر طرف سے عرشہ پر ٹوٹتی تھیں اور ہم سمجھتے تھے کہ اگلی صبح ہمیں آخری نیند سلا دے گی . . . . . بے حد لمبی تھی ہمارے لیے وہ رات — سُولی کی رات کی طرح لمبی۔"

اس وقت جب وہ موت سے رُو در رُو تھا، ابنِ جُبیر کے دل میں کونسی حسرتیں تھیں کون سے ارمان تھے۔ موت سامنے ہو تو پھر یہ اتنی خوفناک نہیں ہوتی۔ اور ایک سچّا متوکّل مسلمان اس زندگی کی عارضی چند پل کی زندگی کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے موت سے نہیں ڈرتا۔ غرناطہ اور وہاں کا آرام دہ گھر ضرور اس کی نظر کے سامنے ہوں گے لیکن میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ خیال اسے اپنے مسوّدوں، یادداشتوں اور جرنل کے ضائع ہو جانے کا ہوگا — جنھیں اس نے عقیدت اور محبّت سے اپنے نفیس اور عمدہ خط میں کتابت کیا تھا، اور جو اب اس کے ساتھ سمندر کی نذر ہو جائیں گے۔

دوسری صبح انھیں بائیں جانب پہاڑ نظر آئے۔

"سِسلی" احمد ابنِ حسّان نے پکار کر کہا۔

"کریٹ" ابن جبیر نے کہا "میں کریٹ کے پہاڑوں کو پہچانتا ہوں۔"

toobaa-elibrary.blogspot.com

طوفان انھیں پھر کریٹ کے ساحل پر دھکیل لایا تھا - چار دن پہلے وہ اس جزیرے کو اپنے دائیں پر چھوڑتے ہوئے گئے تھے - اب کریٹ کے ساحل کے پہاڑ اُن کے بائیں کو تھے -

کچھ دیر بعد سُورج نکل آیا اور طوفان کا زور کافی کم ہوگیا - پھر وہ ایک ہلکی ہوا کی مدد سے کریٹ سے رُخصت ہوئے - سمندر پر اب کل چونتیس دن انھیں ہونے کو آئے تھے - بادبان "مصلّبہ" Square Rigged کر دیے گئے تھے تاکہ وہ ہوا کے ہلکے سے ہلکے جھونکے سے بھی فائدہ اُٹھا سکیں - منگل کو وہی حالت رہی - اس روز انھیں سسلی کی جانب جاتے ہوئے اور جہاز بھی ملے جس سے معلوم ہوا کہ وہ صحیح راستے پر ہیں ان کے دل پھر خوشی سے لبریز ہوگئے - لیکن اچانک ہوا پھر بدل گئی اور تندی کے ساتھ مغرب کی سمت سے چلی اور وہ یونانی جزیرے زانتی کی نوک پر جا پہنچے - بارہ میل کی آبنائے اسے مین لینڈ Main Land سے جُدا کرتی تھی - پندرہ شعبان بائیس نومبر کو وہ بندرگاہ میں داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے طوفان سے پٹتے ہوئے پانچ اور جہاز بھی وہیں آ بھٹکے جن میں سے دو تو پچاس دن ہوئے اسکندریہ سے چلے تھے لیکن ہوا انھیں منزل سے کہیں دُور اُڑا لے گئی تھی - وہ زانتی میں چار دن ٹھہرے اور مسافروں نے جزیرہ والوں سے خورش اور پانی خرید کیا -

"اہل جزیرہ کی روٹی خالص آٹے کی نہیں تھی بلکہ گیہوں میں جَو ملا ہوا تھا، اور اتنی پکی ہوئی تھی کہ بالکل سیاہ ہوگئی تھی - لوگ اس کے باوجود اس کو خریدنے کے لیے ٹوٹ پڑے - حالانکہ یہ کافی مہنگی بھی تھی، ہر ایک شے کی طرح -"

ہفتہ بعد وہ زانتی سے نکلے اور ۲۹، نومبر کو پھر جزائر سسلی کے قریب تھے کہ مغربی ہوا کی گرفت میں آگئے - ایک طوفانِ باد و باراں آیا اور ان پر اولوں کی بارش ہوئی -

لیکن جمعے کی صبح چمکی تو سسلی کا ساحل ان کی آنکھوں کے سامنے تھا! او خدا! کیا یہ حقیقت تھی؟

رات پڑنے تک وہ ساحل کے کافی قریب آگئے اور پھر ایک مخالف ہوا تندی سے اُٹھی اور اس نے تقریباً جہاز کی لکڑی کے پرخچے اُڑا دیے - بادبان اُتار دیے گئے اور وہ پھر اپنے قدموں پر رُک گئے - بارش سے بھرے بادل آ پہنچے اور بارش، رات اور سمندر نے اُنھیں ظلمت کی چادر اُڑھا دی!

"ہماری روحوں نے سب خواہشات بھلا دیں اور قسمت کے استقبال کو بڑھیں - اور وہ رات ہم نے طوفان کے ہلّوں کے نیچے گزاری - خوف سے دبکے اور سہمے ہوئے . . . . . شام کو ہوا تھم گئی - سمندر کا جوش کم ہوا اور روئے آسمان بھڑک اُٹھا - اتوار کی صبح کو ہماری مایوسی، خود اعتمادی میں بدل گئی اور آدمیوں کے چہرے اس طرح دُنیا کو تکتے تھے جیسے وہ کفنوں سے نکل کر آئے ہوں - ہر ایک چیز تازہ، جوان اور اُجلی لگتی تھی -"

مگر سسلی کا ساحل پھر اوجھل ہوچکا تھا -

جمعہ سات ستمبر کو مبارک رمضان کا چاند نکلا - جہاز اٹلی کی مین لینڈ کے پاس ایک اندھے آدمی کی طرح بھٹک رہا تھا - ایک ہلکی شرقی ہوا نے ان کی موافقت کی اور مین لینڈ کے بالمقابل ایک لنگرگاہ میں آئے - یہ قلوریہ کا ایک گاؤں تھا جو شاہ سسلی کی قلمرو میں تھا - بہت سے نصرانی زائر ساحل پر بھوک سے بچنے کے لیے گئے کیونکہ سب کی خورش ختم ہوچکی تھی - مغربیوں نے سکھائے ہوئے بسکٹوں کا ایک رطل (ایک پاؤنڈ)

toobaa-elibrary.blogspot.com

خرید کیا۔ چار حصّے اس کے کیے اور پانی میں بھگو کر اپنا اپنا حصّہ کھایا۔ وہ اس پر ہی شاکر ہو گئے۔ بہت سے زائر جو یہاں اُترے اپنے خورش کا بچا کھچا حصّہ فروخت کرتے گئے اور مسلمانوں نے اپنے ہم سفروں کی ہمدردی کی خاطر جو کچھ ہو سکا خرید کیا۔ حالانکہ مہنگا پن اتنا تھا کہ ایک بسکٹ کی قیمت ایک چاندی کا درہم تھی۔

عکہ سے سسلی کا سفر ایک اچھے جہاز میں اور مددگار ہواؤں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دس بارہ دن کا تھا۔ انھیں اب سمندر پر دو مہینے ہونے کو آئے تھے۔ دُور اندیش اور محتاط لوگ بھی زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کی خورش اپنے ساتھ لے کر سوار ہوئے تھے۔ یہ کسی کے خیال میں نہ تھا کہ ان کے دو ماہ عرشہ پر ہی گزر جائیں گے۔

رمضان کے پہلے دن تڑکے کے وقت اُنھوں نے سسلی کا مشہور مخروطی آتش فشاں پہاڑ دیکھا۔ ایک تکونی شکل کا مہیب دیو جس کے مُنہ سے دھوئیں کے بھبکے نکل رہے تھے۔ ایک موافق ہوا انھیں وہاں سے کشاں کشاں ساحل کی طرف لے جانے لگی لیکن شام کو اس کی شدت بڑھ گئی اور اس نے جہاز کو اس رفتار سے ہانکا کہ ایک لمحے میں اُنھیں آبنائے کے دہانے پر لے آئی۔ رات پڑ چکی تھی۔ مین لینڈ اور جزیرہ سسلی کے درمیان کی یہ آبنائے تین سے چھ میل تک چوڑی تھی۔ اور سمندر اس میں سے اس بے پناہ قوت سے بہتا تھا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ تنگ دامانی اور دباؤ کی وجہ سے آبنائے کے پانی آگ کے اُوپر رکھی دیگ کی طرح اُبلتے تھے۔ جہازوں کا داخلہ اس آبنائے میں مشکل اور پُرخطر تھا۔ وہ آبنائے میں داخل ہوئے ــ مین لینڈ ان کے دائیں کو اور سسلی کا ساحل بائیں کو!

رمضان کی تیسری تاریخ تھی۔ آدھی سے زیادہ رات جا چکی تھی کہ تاروں کی زرد روشنی میں ان کی نظر مسینہ کی عمارتوں پر پڑی ــ ایک خوابیدہ غول: مسینہ میں دُشنیاں

نہیں دِکھتی تھیں۔ یکلخت ملاحوں کی چیخیں طوفان کے شور سے بلند ہوئیں۔ انھیں پتہ لگا کہ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا" کے مصداق ہوا کے زور کے سامنے بے بس جہاز ایک آبی کنارے پر جا چڑھا تھا۔ جینوائی کپتان گرجا۔ "بادبان اُتار دو" ــ مگر ملاحوں کی کوشش کے باوجود بڑے مستول کا چھوٹا بادبان "ارٹمون" نیچے نہ اُترا۔ ملاح ہوا کے خوفناک کھنچاؤ کے باعث کچھ نہ کر سکے۔ آخر جب ان کی محنت بے سود ثابت ہوئی تو کپتان نے خود اوپر چڑھ کے ایک چاقو سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کاٹا کہ شاید اس طرح جہاز رُک جائے۔ اس دوران میں جہاز کا تلا چٹان پر جامد ہو گیا۔

"جہاز پر سے خوفناک چیخیں اُٹھیں اور روزِ حشر آ پہنچا۔ عیسائیوں نے آہ و شیون سے آسمان سر پر اُٹھا لیا، مسلمانوں نے اپنی ذی عظمت آقا اور مالک کی منشا کے سامنے تسلیم میں گردنیں جھکا دیں اور آنے والی زندگی میں بخشش کی اُمید کی رسی سے چمٹ گئے۔ باری باری ہوا اور لہریں جہاز کو تھپیڑے مارتیں جس سے اس کا ایک پتوار ٹوٹ گیا۔ کپتان نے پھر اپنا ایک لنگر نیچے پھینکا کہ شاید وہ گرفت پکڑے اور جہاز رُک جائے مگر بے سود۔ اُس نے پھر لنگر کی رسی کو کاٹ دیا اور اسے سمندر کی نذر کر دیا۔"

"جب ہمیں اس کا یقین ہو چکا کہ ہمارا وقت آن پہنچا ہے تو ہم نے خود کو موت سے ہم آغوش ہونے کے لیے تیار کر لیا۔ ایک دوسرے سے پُرسکون طریق پر الوداع کہی اور رضامندانہ صبر و حوصلے سے آئندہ زندگی کی صبح کا انتظار کرنے لگے۔ اہلِ روم کی عورتوں اور بچّوں کے نالے اور چیخیں بلند تر ہوتی گئیں۔ سب نے عجز اور انکسار سے خدا کی مرضی کے رُوبرو سرِ تسلیم خم کیا اور اس وقت مرد لوگ بھی اپنی

toobaa-elibrary.blogspot.com

مردانگی کھو بیٹھے "۔

" اس اثنا میں ہم قریبی ساحل کی طرف تک رہے تھے ۔ کبھی خیال آتا کہ سمندر میں چھلانگ لگا کر تیرنے کی کوشش کریں ۔ پھر سوچتے کہ جہاز پر موت کا انتظار کرنا بہتر ہے ۔ ملاحوں نے اپنے اہم ترین آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو ڈوبتے جہاز سے لے جانے کی خاطر ایک لمبی کشتی کو نیچے پانی میں اُتارا ۔ اُنھوں نے ساحل تک ایک پھیرا کیا لیکن واپس نہ آسکے اور لہروں نے کشتی کو ساحل پر اُچھال کر ریزہ ریزہ کردیا ۔ پھر تو مایوسی نے ہمارے قلوب کو پوری طرح جکڑ لیا (کیونکہ جب تک لمبی کشتی تھی ۔ کچھ اُمید بچنے کی باقی تھی) ۔ اور ابھی ہم اس دہشت ناکی کے عالم میں تھے کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور خدا کے لمبے ہاتھ نے مدد اور اعانت کی "۔

ان سے آدھ میل سے بھی کم فاصلے پر مسینہ کا شہر تھا اور اس کے گنبد اور مینار صبح کی روشنی میں جاگ رہے تھے ۔ اُنھوں نے اپنی آنکھیں ملیں، کیا وہ ٹھیک دیکھ رہی تھیں! کیا وہ ابھی زندہ تھے ؟

ابنِ جُبیر نے احمد ابن حسان سے کہا " احمد! خدا کی قدرت ۔ بہت سوں کو خدا اُن کے گھروں کی دہلیز پر سے ہی اپنے گھر لے جاتا ہے "۔

سورج اُبھرا اور مسینہ کی کھاڑی میں سے چھوٹی کشتیاں اُن کی طرف آنے لگیں ۔ ان کی چیخیں شہر میں سُنی گئی تھیں اور سسلی کا بادشاہ ولیم بذاتِ خود اس جان بچانے کے عمل کی دیکھ بھال کے لیے اپنے خُدام کے ساتھ پتن پر موجود تھا ۔ مسافروں نے ایک ہلڑ میں نیچے کشتیوں میں جانے کی کوشش کی لیکن موجوں کی تندی کشتیوں کو جہاز کے قریب آنے سے روکتی تھی ۔ جب طوفان تھما تو وہ آخر ان میں اُترنے میں کامیاب ہوگئے اور پُرتلاطم موجوں

میں سے گزرتے ہوئے سلامتی سے پتن پر پہنچے ۔ اُنھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک دوسرے کو بوسے دیے ۔

بادشاہ ولیم ایک اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا ۔ جب اس نے دیکھا کہ کئی ایک قلاش مسلمان ابھی تک جہاز پر ہیں کیونکہ ان کی جیب میں کشتیوں کے مالکوں کو دینے کے لیے اُجرت کے دام نہیں (یہ لوگ بڑی اُجرت مانگتے تھے)، تو اس نے اپنے چانسلر کو حکم دیا کہ ان مسافروں میں ہر ایک کو اس کے مُلک کے رائج سکّے کے سو سو رباعی دے دیے جائیں تاکہ وہ اُترنے پر کشتی رانوں کی اُجرت چکا سکیں ۔ سب مسلمان اس طرح بچ گئے ۔ اگرچہ بعض کا کچھ اسباب اس بدطالع جہاز میں ہی رہ گیا ۔ نصرانی اپنا کل مال و اسباب جہاز پر سے لے آئے ۔ دوسرے دن لہروں نے جہاز کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا اور اس کے شکستہ اعضاء ساحل پر بکھرے پڑے تھے ۔

اُن کی سلامتی انھیں ایک معجزہ لگی ہوگی اور واقعی وہ موت کے بالکل نزدیک ہی تو تھے ! قرونِ وسطیٰ کے بحری سفر کے خطرات حقیقی اور بہت سے تھے اور ابنِ جُبیر نے ایک جہاز کی تباہی کے نظارے کی بڑی بولتی چالتی تصویر کھینچی ہے ۔ اس زمانے میں بڑے رُخانی جہازوں نے ابھی بے قابو سمندروں پر فتح نہ پائی تھی اور سمندری دیوتا نیپچون Neptune ابھی طاقت ور اور غالب تھا !

مسافروں کی خوش قسمتی تھی کہ بادشاہ ولیم خود پتن پر آ موجود ہوا ورنہ مسینہ والے کشتی والے جہازیوں کو لوٹ کھسوٹ کر ننگا کر دیتے اور اپنے رواج کے مطابق مسلمانوں کو اسیری کی زنجیریں پہنا دیتے ۔ ولیم مسینہ میں ایک دو روز پہلے ہی اپنے جنگی بیڑے کے معائنہ کے لیے آیا تھا جسے وہ بازنطینی قسطنطنیہ میں بھیجنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

میسینہ میں وہ ایک سرائے میں ٹھہرے۔ یہاں کوئی قابلِ رہائش جگہ نہ تھی۔ اگرچہ میسینہ سوداگروں کی منڈی تھی اور دُنیا کے جہازوں کا مرکز۔ ہمارے اُندلسی عالم کو یہ شہر اپنے الحاد کی وجہ سے بڑا بے مسرّت لگا۔ کوئی مسلمان یہاں آباد نہ تھا۔ اور اس کے غلاظت سے پُر گلی کوچے صلیب کے پجاریوں سے ٹھنسے ہوئے تھے۔ میسینہ کے لوگ اجنبیوں سے بڑی رُکھائی سے پیش آئے اور دو تین دن میں ہی مغربی حاجیوں کا دل اس سُور خانے سے اُچاٹ ہوگیا۔

"میسینہ پہاڑوں کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے ہے جن کی نچلی ڈھلانیں شہر کی خندقوں اور قلعہ بندیوں تک آتی ہیں۔ جنوب میں سمندر ہے اور اس کی بندرگاہ سب بحری بندرگاہوں میں سے پُرحیرت ہے چونکہ بڑے جہاز اس میں سمندروں سے داخل ہوتے ہیں اور سیدھے اس کے پتن پر آ لگتے ہیں۔ جہازوں اور ساحل کے بیچ ایک تختہ ڈال دیا جاتا ہے جس پر سے لوگ آتے جاتے ہیں اور قلی اسباب اور مال جہاز پر پہنچاتے ہیں۔ اس طرح چڑھانے یا اُتارنے کے لیے کشتیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تم جہازوں کو پتن کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے اس طرح دیکھو گے جیسے گھوڑے اپنے کھونٹوں سے یا اصطبل میں ایک قطار میں باندھے جاتے ہیں۔ میسینہ کا شہر سِسلی کے ایک سرے پر ہے۔ سِسلی ایک جزیرہ ہے جس میں بہت سے شہر، کشت زار اور گاؤں ہیں۔ اس کی لمبائی سات دن کی مسافت ہے اور چوڑائی پانچ دن کی۔ اس جزیرے کی شادابی اور زرخیزی بیان کی قدرت سے باہر ہے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ اپنے کھلیانوں کی وسعت اور اپنی فصلوں کی فراوانی میں یہ شہر ہسپانیہ کی بیٹی ہے ...... مگر ہیہات جدھر دیکھو صلیب کے پجاری نظر آتے ہیں۔ کچھ مسلمان بھی ان کے درمیان اپنی جائداد اور

کھیتوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ عیسائی ان سے اچھا سلوک کرتے ہیں اور ان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ لیکن ان سے جزیہ وصول کرتے ہیں۔

میسینہ میں چند مسلمان پیشہ ور ایک غریبانہ محلّہ میں رہتے تھے۔ وہ ان کو دیکھنے نہ گئے۔ لیکن ایک دن جب وہ اُندلس جانے والے جہاز کے متعلق پُوچھ گچھ کر کے اپنی سرائے میں لوٹے تو ایک خادم لڑکا اُن کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کو ایک طرف لے گیا اور ان سے سرگوشی میں کہنے لگا کہ اس کا مالک، بادشاہ ولیم کا ممتاز خدمت گار، اُن سے تھوڑی دیر کے لیے ملنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اس کے ساتھ خدمت گار کی محلسرا پر چلیں گے؟ کچھ متعجب اور قدرے سہمے ہوئے دونوں ساتھی لڑکے کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ وہ شہر کے اندر ایک اُونچی محلسرا پر پہنچے۔

وہ جانتے تھے کہ ولیم کے خدمت گار جو اس کی سلطنت کے منصبدار اور مہتمم تھے، سب کے سب دل میں مسلمان تھے۔ یہ محلسرا اس سلطنت کے ایک بڑے ممتاز خدمتگار عبدالمسیح کی تھی۔ عبدالمسیح ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ انھیں اپنے دیوان خانے میں لے گیا جو شاہانہ ٹھاٹھ سے آراستہ تھا۔ اور جب شربت اور ٹھنڈے پھلوں سے ان کی تواضع کر چکا تو ان سے کھل کر اور بے تکلّف ہو کر باتیں کرنے لگا۔ اُس نے پہلے دیوان خانے میں سے ان نوکروں کو بھیج دیا جن پر اسے اعتماد نہ تھا۔ وہ اُندلسیوں سے مکّہ معظمہ، اس کے مقدّس روضوں اور مدینہ منوّرہ اور شام کی پاک جگہوں کے متعلق پُوچھتا رہا۔ ابنِ جُبیر ضرور ایک مُوثّر داستان گو ہوگا اور جب اُندلسیوں نے خدمتگار کو ایک مبارک جگہ کا حال بتانا شرُوع کیا تو اس کا دل شوقِ تمنّا کی حرارت سے پگھل گیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"محترم مغربیو! کیا تم مجھے کوئی پاک نشانی دو گے جو تم مکّہ اور مدینہ سے لائے ہو۔ میں التجا کرتا ہوں کہ جو کچھ تم دے سکتے ہو، اس میں تامّل نہ کرو ......"

ابنِ جُبیر نے کہا کہ ان کے پاس سرائے میں ایک عقیق کے دانوں کی تسبیح، خاک پاک کا ٹکڑا اور آبِ زمزم کی کچھ کپّیاں ہیں اور وہ ان میں سے چند چیزیں بخوشی اس کو دے دیں گے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

"میں لڑکے کو تمہارے ہمراہ چیزیں لانے کے لیے بھیج دوں گا" عبدالمسیح بولا۔ "تم خوش نصیب ہو تم کھلم کھلا اسلام میں اپنے ایمان کا اظہار کر سکتے ہو اور تم اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو۔ اور خدا کی مرضی سے اپنی تجارت میں پھولتے پھلتے ہو۔ لیکن ہم: ہم سسلی کے مجبور بدنصیب جو خود کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنا مذہب چھپانا پڑتا ہے اور اپنی جانوں کے ڈر سے ہمیں اپنی عبادت اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی چھپ چھپ کر کرنی پڑتی ہے۔ ہم ایک کافر ملحد کے قبضے میں بندھے ہیں جس نے ہماری گردنوں میں غلامی کا طوق ڈال دیا ہے۔ ہماری زندگی کا واحد مقصد اور واحد سعادت اب یہی ہے کہ تم جیسے حاجیوں سے ملیں۔ کچھ اپنے دل کا حال اُن سے کہیں اور ان سے ملتجی ہوں کہ ہم گناہگاروں کے لیے پروردگار کی جناب میں رحمت کی دُعا مانگیں اور ان بیش قیمت تبرکات ہی سے اپنا جی بہلائیں جو ہمیں ان سے حاصل ہوں۔"

11

مسینہ (سسلی) سے المدینہ اطرابنش اور غرناطہ

اُندلسیوں کے دل اس نوجوان کی ہمدردی اور غمخواری میں پگھل گئے۔ یہاں تک کہ ابنِ جبیر نے اپنی موتیوں کی تسبیح جس کے نگینے میں سے مکہ معظمہ کی تصویر نظر آتی تھی، اُسے دے دی۔ عبدالمسیح نے اُن کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اُس نے رازدارانہ انداز میں انھیں اپنے رفیقوں اور دوسرے خدمتگاروں کے بارے میں بتایا۔

"ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو رمضان المبارک میں روزے نہ رکھتا ہو، یا خدا کی خوشنودی کے لیے خیرات نہ کرتا ہو۔"

عبدالمسیح نے کہا:۔

"یہ لڑکا جو تمھیں لانے گیا تھا ایک مسلمان اسیر کا بیٹا ہے جسے میں نے رہا کرایا ہے۔ ہم سب مسلمان قیدیوں کو کسی مسلمان تاجر کے توسط سے رہا کراتے رہتے ہیں تاکہ ولیم کو ہم پر شک نہ پڑے۔ ہم ان کے بچوں کی پرورش کرتے، اور بڑے ہونے پر ان کی شادیاں کرتے ہیں۔"

اس نوجوان سے وہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور اس سے انھیں بادشاہ ولیم کی عادتوں اور خصلتوں کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ جب وہ رخصت ہوئے تو عبدالمسیح نے دونوں مغربیوں کا بوسہ لیا اور انھیں محل کے دروازے تک پہنچانے آیا۔ اُس نے اُن کو ہدایت کی کہ اس ملاقات کا ذکر

toobaa-elibrary.blogspot.com

کسی سے نہ کریں ۔

لیکن اگر عبدالمسیح اور اس کے رفقاء پختہ کردار کے شخص ہوتے تو وہ کبھی ظاہراً بھی عیسائی بن کر نہ رہتے ۔ اور اگر ان کی اسلام سے محبت اپنے عہدوں اور جاہ و حشمت کی محبت سے زیادہ ہوتی تو وہ پل بھر کے لیے اس زندگی کو قبول نہ کرتے ۔ وہ بڑی آسانی سے سسلی کی بندرگاہوں میں سے کسی ایک سے بھیس بدل کر فرار ہو سکتے تھے ۔ مگر ایک طرف وہ اپنے ٹھاٹھ باٹھ کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اور دوسری طرف اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے ۔

اندلسیوں نے خدمت گاروں کی زندگی کے اس پہلو پر غور نہیں کیا ۔ بلکہ اُنھیں خوشی تھی کہ وہ لوگ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے وہاں موجود تھے ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بادشاہ ولیم گو ایک کٹر عیسائی تھا لیکن ایک سادہ طبیعت اور نیک دل شخص تھا ۔ یقیناً وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوگا کہ اپنے خدمت گاروں کے ان مخفی عقائد اور رابطوں سے واقف نہ ہو ۔ لیکن ڈپلومیسی یا کسی اور وجہ سے وہ یہ ظاہر کرتا کہ اسے ان باتوں کا کوئی علم نہیں ۔

بارہ رمضان ــ ۱۸ دسمبر ۔ کو وہ مسینہ سے سسلی کے ایک اور شہر المدینہ کو جانے کے لیے ایک چھوٹے جہاز میں سوار ہوئے ۔ مسینہ کے بازاروں کی غلیظ بوئیں اور صلیبی پجاریوں کے ہجوم ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکے تھے ! المدینہ مسلمانوں کی حکومت کے وقت میں سسلی کا دارالخلافہ رہا تھا اور وہاں اسلامی بادشاہوں کی یادگاریں تھیں ۔ اب وہ عیسائی سسلی کا دارالسلطنت تھا ۔ گو عیسائیوں نے اس کا نام بدل کر پالرمو رکھ دیا تھا ۔

وہ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے ۔ کھلیان ، بستیاں ، چمن زار اور سبز پوش پہاڑیوں پر پریوں کے محلوں جیسے قلعے ان کو جا بجا نظر آتے ۔ وہ اپنے دائیں کو نو چٹانی جزیرے چھوڑتے ہوئے گئے ۔ جن میں سے دو جزیروں کے پہاڑوں کی چوٹیوں میں سے آگ کی زبانیں اوپر لپکتی تھیں ۔ دوسرے دن شام کو وہ شفلودی کی

بندرگاہ میں آئے ۔ وہ ایک کشتی پر شہر میں گئے ۔ یہ ایک چھوٹا سا ساحلی شہر تھا مگر انگوروں کے باغوں سے گھرا ہوا ۔ مسلمانوں کی ایک جماعت بھی وہاں رہتی تھی ۔ شفلودی سے آدھی رات کو چل کر وہ جمعرات کو پہلے پہر ترمہ میں آئے ۔ ترمہ سے وہ ایک اور چھوٹے جہاز میں سوار ہوئے ۔ اُس رات وہ شہر کے نیچے ایک دریا میں لنگرانداز رہے جس میں سمندر سے مدوجزر چڑھتا اور اُترتا تھا ۔ ہَوا پھر مغرب کی ہوگئی ۔ اور اب ان کے لیے یہاں سے نکلنا ناممکن ہوگیا ۔

لیکن المدینہ کُل پچیس میل دُور تھا ۔ اور اُندلسیوں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں وہ ترمہ میں ہی بیٹھے نہ رہ جائیں جہاز کو چھوڑ کر پا پیادہ المدینہ جانے کا قصد باندھا ۔ چنانچہ دوسری صبح وہ تھوڑا سا اسباب ساتھ لیے اور اپنے کچھ ساتھیوں کو اسباب کی حفاظت کے لیے جہاز میں چھوڑ کر المدینہ کو روانہ ہو گئے ۔

المدینہ کی سڑک شاداب تاکستانوں اور سبز پوش پہاڑیوں میں سے ہو کر جاتی تھی ۔ اور اس پر ایک بازار کی سی گہماگہمی تھی ۔ عیسائیوں کے گروہ جو انھیں راستے میں ملتے سلام کہنے میں پہل کرتے تھے ۔ اور ان سے بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آتے ۔

"ہم نے مسلمانوں کی طرف ان کے دوستانہ انداز میں ، اور اُن کے چپکے سے دل میں گھر کر لینے والے طرزِ تخاطب میں وہ چیز دیکھی جو سادہ دلوں کو بہکانے کے لیے کافی ہے ۔ خدا اپنی قدرت اور فیاضی سے محمدؐ کی امت کو اس ورغلاہٹ سے مامون رکھے !"

شام ہو رہی تھی کہ وہ اپنے تھیلوں سے لدے پھندے قصر سعد پہنچے ۔ المدینہ یہاں سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر تھا ۔ مگر تھکان ان پر غالب آگئی ۔ رات اُنھوں نے وہاں بسر کی ۔

"قلعہ سمندری ساحل پر ہے اور بلند بام اور قدیم ہے ۔ یہ قلعہ اس جزیرے پر اسلامی قبضہ کے دوران میں تعمیر ہوا تھا اور اب بھی خدا کے فضل سے مسلمان یہاں رہتے ہیں ۔ اس کے اردگرد عارف اور زاہد مسلمانوں کی ان گنت قبریں ہیں ۔ اس

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے سامنے باؤلی عورت کا چشمہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی چوٹی پر دُنیا کی ایک حسین ترین
مسجد بنی ہوئی ہے جس کی بے داغ چٹائیاں ایسی صنعت کاری کا نمونہ ہیں کہ اُن سے
اچھی میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ اور اس کے اندر تانبے اور بلور کی چالیس لالٹینیں لٹکتی
ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے ایک بڑی خوش گوار اور مسرت بخش رات مسجد میں گزاری
اور ایک مدّت کے بعد نماز کے لیے دعوت کی پکار سُنی ۔"

مسجد کے مقیموں نے ان کی بڑی عزّت کی اور امام نے اُنھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ صبح کی نماز کے بعد وہ پھر تھیلے کندھے پر رکھے المدینہ کی سڑک پر تھے انہوں نے عیسائی مریضوں کے علاج کے کلیسا دیکھے۔ اسلامی ہسپتالوں کے طرز پر بنے ہوئے ۔

وہ المدینہ کے دروازے پر پہنچے اور اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ پہرے کی چوکی کے ایک ٹُومی سارجنٹ نے انھیں روکا ۔ وہ انھیں بادشاہ ولیم کے محل کے بازو میں ایک دروازے میں سے لے چلا۔ پتھر کی پختہ پٹریوں، دروازوں اور فراخ صحنوں میں سے وہ لے جائے گئے ۔ ان کی آنکھیں سر بفلک کشیدہ محلسرائوں، موزوں چوراہوں، باغات اور حکام کے حجروں کو تکتی تھیں اور حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں انھوں نے ایک بڑے صحن میں ایک ایوان بھی دیکھا جس کے گرد ستون برآمدہ تھا۔ سارجنٹ نے جو ایک خوش گوار شخص تھا اور کچھ باتونی ، انھیں بتایا کہ یہ بادشاہ کا ایوانِ طعام ہے ۔ اور برآمدے اور حجرے وہ جگہیں ہیں جہاں اسکے مجسٹریٹ، عہدیدار اور مہتمم حاضر باش بیٹھتے ہیں ۔

پھر اُنھوں نے کمشنر کو آتے دیکھا۔ اپنے خدمت گاروں کے درمیان جو پیچھے سے اس کے فرغل کے دامن کو اُٹھائے تھے وہ ایک باوقار بوڑھا آدمی نظر آتا تھا۔ تیز جانچتی ہوئی آنکھیں، لمبی سفید مونچھیں، لوچدار آواز، اُس نے آتے ہی ملائم عربی میں پوچھا :

"آپ کس ملک کے باشندے ہیں اور یہاں کیونکر آئے ہیں ؟"

اُنھوں نے اُسے بتایا۔ اچھے بوڑھے کمشنر نے ان سے ہمدردی جتائی اور سارجنٹ کو حکم دیا :

"یہ مسلمان حاجی ہیں، ان کو جانے دو !" اُس نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ آیا اُنھوں نے قسطنطنیہ کی کوئی خبریں سُنی تھیں۔ اُندلسی اسے کچھ نہ بتا سکے اور دل ہی دل میں تعجب کرنے لگے کہ قسطنطنیہ کی وہ کیا خبریں ہیں جن کے بارے میں کمشنر اُن سے پُوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا ۔

جب وہ قلعے سے نکلے تو ایک عیسائی پہرے دار جو پھاٹک پر بیٹھا تھا بڑے چکنے چُپڑے انداز میں ان سے مخاطب ہوا :

"اے حاجیو ! اپنے تھیلوں کے مال پر نگاہ رکھنا۔ کہیں کسٹم والے تم پر پل نہ پڑیں "۔

اس کا خیال تھا کہ ان کے پاس محصول کا مالِ سوداگری تھا۔ اس کے ایک اور عیسائی ساتھی نے کہا:

"تم بھی کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی ہمارے بادشاہ کی پناہ میں آئے اور پھر بھی کوئی اُسے آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے ۔ میں تو اُمید کرتا ہوں کہ ہزاروں رُباعیات سے مالا مال ہو کر یہ لوگ اپنے گھروں کو جائیں گے ۔ جاؤ ، امن میں رہو، اور کسی بات کا فکر نہ کرو !"

اس طرح عیسائی اپنی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کی نمود و نمائش کرتے ، اور سادہ لوحوں کے دلوں پر اپنی چکنی چُپڑی باتوں سے ڈاکہ ڈالتے تھے ۔ قلعے سے نکل کر وہ سیدھے شہر میں ایک سرائے پر آئے اور وہاں فروکش ہو گئے ۔

ایک قدیم اور حسین وجمیل شہر المدینہ —— یا پالرمو —— تھا۔ شاندار، البیلا، اور نگاہ کو لبھانے والا ! عمارتوں کے درمیان جا بجا کُشادہ پارک اور بولوارڈ تھے۔ سڑکیں چوڑی اور چمکدار تھیں۔ اُندلسی سیّاح کی آنکھیں اس کمالِ حسن سے چندھیا گئیں ۔

"بادشاہ کی محلسرائیں اُونچے حصّوں پر ایک عورت کی گردن کے گرد موتیوں کی
مالا کی طرح دکھائی دیتی ہیں ۔ بادشاہ خوشی و تفریح کی خاطر باغوں اور صحنوں میں
گھومتا ہے ۔ آہ کتنے محل —— خدا کرے وہ زیادہ دیر اس کے نہ رہیں ——
عمارتیں، پہرے کے مینار، جھروکے دار بالانشین اس کے پاس ہیں اور کتنی عمدہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

خانقاہیں جن کے راہبوں کو اُس نے بڑی جاگیریں لگا کے باآرام کر دیا ہے اور کتنے، کتنے ہی سونے اور چاندی کے صلیبوں سے آراستہ کلیسا! خدا اس جزیرے کے دن پھیرے اور اسے پھر اپنے دین کے لیے ایک گھر بنائے اور اپنی قدرت سے اسے خوف میں سے نکال کر سلامتی میں لائے! اس شہر کے مسلمان مذہب کی باقیماندہ شہادت کو قائم کیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی بہت سی مسجدوں کو درست حالت میں رکھتے ہیں اور مؤذن کی پکار پر نماز کے لیے آتے ہیں۔ اپنے اطراف میں عیسائیوں سے علیحدہ رہتے ہیں۔ بازار ان سے (مسلمانوں سے) بھرے ہوئے ہیں۔ اور تجارت ان کے ہاتھ میں ہے۔ جمعہ کی نماز کے لیے وہ جمع نہیں ہوتے کیونکہ خطبہ پڑھنے کی ممانعت ہے۔ صرف عید کے دن وہ خطبہ پڑھتے ہیں اور عباسی خلیفوں کے لیے دُعا مانگتے ہیں۔ ان کا ایک قاضی ہے جو ان کے مقدموں کا فیصلہ کرتا ہے اور ایک کلیسائی مسجد جس میں وہ پاک مہینے میں لیمپوں تلے تراویح کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ عام مسجدیں بے شمار ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر قرآن پڑھانے والوں کے لیے مکتبوں کا کام دیتی ہیں۔ لیکن بالعموم مسلمان اپنے الحاد کی سرپرستی قبول کرنے والے بھائیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، اور نہ ان کے مال، اولاد اور عورتوں ہی کے لیے وہاں کوئی سلامتی ہے۔"

المدینہ پھر اُندلسی کو قرطبہ کی یاد دلاتا ہے۔ قرطبہ کی طرح المدینہ میں بھی نئے شہر کے وسط میں ایک پرانا شہر قصر قدیم نام کا تھا جس کی اُونچی محلسرائیں اور آسمان میں چھپے ہوئے بُرج اپنے تجمّل سے نگاہِ نظارہ کو پریشان کر دیتے۔

اُنھوں نے الانطاکی کا کلیسا بھی میلادِ مسیح کے روز دیکھا۔ ابنِ جُبیر اسے بلاشبہ دُنیا کی حسین ترین عمارت کہتا ہے۔ اس کی اندرونی دیواریں سونے سے مڑھی ہوئی تھیں۔ اس میں رنگین مرمر کے تختے تھے جن پر زریں پچی کاری کا کام تھا۔ کئی سو من سونا اس پر خرچ ہوا تھا۔

"اس شہر کی عیسائی عورتیں مسلمان عورتوں کے رسم و رواج کی پیروی کرتی ہیں۔ زبان کی تیز ہیں۔ اپنے لبادوں کو اپنے جسموں کے گرد لپیٹتی ہیں اور نقاب پہنتی ہیں۔ میلادِ مسیح کے روز وہ زرکار ریشم کی پوشاکیں پہنے، چلبلے لبادے اوپر لیے اور رنگین نقابیں مُنہ پر ڈالے اپنے کلیساؤں کو جاتی ہیں۔ مسلمان عورتوں کی سب تزئینِ حسن وہ بھی اسی طرح کرتی ہیں۔ وہی زیورات، وہی ہاتھوں میں مہندی، اور عطر! ہمیں ایک ادبی ظرافت کے جھٹکے کے طور پر شاعر کے الفاظ یاد آتے ہیں:

"اگر کوئی شخص کبھی کلیسا میں داخل ہو

تو وہاں آہوؤں اور غزالوں سے ہی اسے سابقہ پیش آئے!"

سو متین اُندلسی آخر عیسائی سسلی میں کچھ گیلنٹ (GALLANT) محسوس کرتا ہے اور اس کی طبعی شوخی اس کی متانت کی تیرہ و تار تہوں میں سے ایک لحظہ کے لیے کوندتی ہے۔

رمضان المبارک کی بائیس کو وہ اطرابنش کے لیے روانہ ہوئے۔ المدینہ کے ایک سوداگر دوست سے انھیں معلوم ہوا تھا کہ اطرابنش کی بندرگاہ میں دو جہاز لنگر انداز تھے جن میں سے ایک کی منزلِ مقصود ساحلِ اُندلس تھا۔ عجیب اتفاق سے یہ وہی جہاز نکلا جس میں سوار ہو کر وہ اسکندریہ گئے تھے۔

اطرابنش جاتے ہوئے انھیں صرف ایک رات راہ میں آئی جو اُنھوں نے علقمہ کے بڑے اور وسیع قصبہ میں گزاری۔ رمضان کی تئیس کو وہ سہ پہر کے وقت اطرابنش پہنچ گئے اور کرایے پر ایک مکان لے کر اس میں ٹھہرے۔ اطرابنش فصیل کے اندر ایک چھوٹا شہر تھا۔ فاختہ کی طرح سفید! اپنی عمدہ بندرگاہ کی وجہ سے یہ جہازوں کے لیے بڑا موزوں تھا۔ اور زیادہ تر برّ العدوہ۔ افریقہ کو جہاز یہاں سے ہی جاتے تھے۔

"یہ شہر سمندر کے حلق میں ہے جو تین طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ ....
اس کے قریب روم کا ایک بڑا شہر ہے جس کی عورتیں اپنی خوبصورتی کے لیے عالم میں مشہور ہیں۔ خدا کرے کہ وہ مسلمانوں کی اسیر بنیں۔ انگوروں کے باغ اور اناج کے کھلیان پہاڑ کی ڈھلانوں پر بھی ہیں۔"

toobaa-elibrary.blogspot.com

بندرگاہ میں دو جہاز مغرب جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

عید کے روز اُنھوں نے اطرابنش کی ایک مسجد میں نمازِ عید ادا کی۔ اُنھوں نے مسافروں کی سی دُعا مانگی کہ خدایا سب پردیسیوں کو ان کے وطن واپس لوٹا دے۔ باقی لوگ تو باجے اور قرنا کے ساتھ اپنے مجسٹریٹ (قاضی) کے ساتھ 'مصلّٰی' کو چلے گئے۔ اور اُندلسیوں نے عیسائیوں کی رواداری پر تعجب کیا۔

وہ جہاز کے ایجنٹ سے بھی ملے۔ بڑی حیص بیص کے بعد اس سے کرایے کا فیصلہ ہوا۔ جب سب کام تیار ہو گیا تو بادشاہ ولیم کا حکیم شہر کے ناظم کو پہنچا کہ اطرابنش کی بندرگاہ میں ٹھہرے ہوئے تمام جہاز روک دیے جائیں۔ بازار میں یہ خبر گرم تھی کہ بادشاہ ولیم ایک بڑا بیڑا تیار کر رہا ہے جو کسی نامعلوم جگہ کو جانے والا ہے۔ جب تک بیڑا روانہ نہ ہوگا کسی جہاز کو سسلی کے ساحل سے چلنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ مبادا کہ بیڑے کی خبر پہلے ہی سمندروں پر پھیل جائے۔ ایک دن وہ اپنے جہاز کے جینوائی مالک سے ایک ہوٹل پر ملے۔ وہ ان کو ایک طرف لے گیا۔

"یہ سچ ہے" اُس نے بتایا "کہ رومی بادشاہ نے یہ حکم دیا ہے مگر میں نے ناظم شہر کی مٹھی گرم کر دی ہے اور اب جب بھی ہوا موافق ہوئی جہاز چل دے گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم اب جہاز پر سوار ہو جاؤ۔ ورنہ میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ خدا جانے ناظم کب اپنی نیت بدل دے۔"

مگر جینوائی جہاز ابھی پانی اور خورش کا سامان لے رہا تھا اور چونکہ اس پر جانے والے مسافر گنتی کے تھے اس لیے اس کے مسافروں کے بغیر چل دینے کا امکان نہیں تھا۔ اُسی دن جس دن جینوائی اُنھیں ملا ہسپانیہ سے ایک جہاز بندرگاہ میں آیا۔ اس کے ایک شامی مسافر سے اُنھیں یہ منحوس خبر معلوم ہوئی کہ میورقہ کے عیسائی بادشاہ نے بجایہ کے شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس خبر نے انھیں اُداسی کے تحت الثریٰ میں ڈال دیا۔

اِن دنوں ہوٹلوں اور چوراہوں میں اطرابنش کے لوگوں کا ایک ہی موضوع تھا۔ جنگی بیڑا کس لیے ہے؟ اور کہاں جانے والا ہے؟ اُندلسیوں نے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور لوگوں کی باتیں غور

سے سنتے رہے۔ جو کچھ اُنھوں نے سُنا اس نے اُنھیں حیرت زدہ کر دیا۔

کوئی کہتا کہ بیڑے میں جنگی گیلیوں اور ڈھووں کی تعداد ملا جُلا کے تین سو بادبان ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہے اور صرف سو جہاز تو غلّے اور خورش سے لدے ہوئے اس کے ہمراہ جا رہے ہیں۔ بعض لوگ یقین سے کہتے کہ اس کی منزلِ مقصود اسکندریہ ہے اور بادشاہ کے سپاہی مصر پر قبضہ کرنے جا رہے ہیں۔ بعضوں کا قیاس تھا کہ یہ بیڑا موحدوں کو کچلنے کے لیے میورقہ جا رہا ہے۔ دوسرے کہتے: ولیم عہدنامے کی خلاف ورزی کر کے افریقہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔

ایک دن اتفاق سے بازار میں بادشاہ ولیم کا خدمت گار عبدالمسیح ان کو مل گیا جو اسی روز المدینہ سے اطرابنش کسی کام سے آیا تھا۔ وہ بھڑکیلی پوشاکوں میں ملبوس اپنے خدم و حشم کے ہمراہ منڈی میں شام کی بنی ہوئی قیمتی زربفت دیکھ رہا تھا۔ اُس نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا اور خرید و فروخت کرنے کے بعد ان کو اپنے ہمراہ شہر کی پچھلی پہاڑی پر لے گیا۔ جہاں انگوروں کے باغ میں اس کا ایک چھوٹا اور جمیل وِلّا (VILLA) تھا۔ وہ اس کے ساتھ دو تین گھنٹے رہے اور عبدالمسیح نے انھیں پُراسرار بیڑے کی ساری داستان سُنائی۔

"نہیں نہیں معزز مغربیو!" اُس نے کہا "یہ اُندلس پر حملے کے لیے نہیں جا رہا۔ تم خاطر جمع رکھو۔ میں تمھیں بتاتا ہوں مگر برائے مہربانی یہ راز اپنے سینوں میں رکھنا اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔" اور پھر اپنا منہ آگے کر کے اُس نے سرگوشی میں کہا "یہ بیڑا قسطنطنیۂ عظمیٰ جا رہا ہے۔"

اُندلسیوں نے چونک کر کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"قسطنطنیہ میں بڑے اہم واقعات ان دنوں رونما ہوئے ہیں۔" عبدالمسیح بولا "قسطنطنیہ کا شہنشاہ عمینوئل مرتے وقت سلطنت اپنی بیوی کو چھوڑ گیا تھا جس کا بیٹا ابھی لڑکا ہی تھا۔ لڑکے کے ایک چچا نے تخت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ عمینوئل کی ملکہ کو زہر دے کر مروا دیا اور لڑکے کو ایک خاص معتمد کے حوالے کیا کہ اسے جنگل میں شکار کے بہانے سے لے جا کر ٹھکانے لگا دے۔ اس معتمد کو لڑکے پر رحم آ گیا اور اُس نے اُسے اپنے ایک ہمراز دوست جہازی کپتان کے حوالے کیا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے رُوما سے دُور کسی پوشیدہ جگہ میں پہنچا دے۔ بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد وہ لڑکا بڑی خستہ حالت میں ایک پادری کے نوکر کی حیثیت میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس جزیرے پر آیا اور اپنے شاہی جسم کو ایک ٹھلوے کے خرقہ میں چھپائے پھرا۔ لیکن یہ راز فاش ہوگیا۔ جب بادشاہ ولیم کے حکم سے اس لڑکے کو اس کے روبرو پیش کیا گیا اور لڑکے سے اس کی حقیقت پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ وہ پادری کا ٹھلوا اور نوکر ہے۔ لیکن جینوائیوں کی ایک ٹولی نے جو قسطنطنیہ کی راہ پر جزیرے میں جہاز تبدیل کرنے کے لیے رُکی تھی۔ اس کے عمینوئل کا لڑکا ہونے کی تصدیق کی بلکہ اس کا ثبوت پیش کر دیا۔ بادشاہ ولیم نے پھر اس لڑکے کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کی رہائش کے لیے مکان اور خدمت کو نوکر چاکر مقرر کر دیے۔ اس پر کڑی نگرانی رکھی جاتی کیونکہ بادشاہ ولیم ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا غاصب چچازاد بھائی اسے کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ اس لڑکے کی ایک بہن تھی کہ چار دانگِ عالم میں اس کے حُسن کا شہرہ تھا۔ وہ غاصب چچازاد بھائی اس پر فریفتہ ہوگیا لیکن وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ بوجہ اس کے کہ اہلِ روم اور عیسائیوں میں دستور ہے کہ اپنی قرابت دار عورتوں سے مناکحت نہیں کرتے۔ مگر تند و تیز عشق، اندھی اور بیخود کر دینے والی خواہش۔ اور وہ لذّت جو انسان کو مہا آنند میں پہنچا کر یکلخت چھوڑ جاتی ہے۔ یہ سب اس پر غلبہ کیے ہوئے تھیں۔ اور اُنھوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس دوشیزہ کو اغوا کر کے اپنے ہمراہ ضارب کے فرمانروا امیر مسعود کے پاس لے جائے۔ امیر مسعود کی موجودگی میں اُس نے اپنی محبوبہ چچازاد بہن کے ساتھ مذہب اسلام قبول کیا اور ایک سنہری صلیب کہ آگ میں تپائی گئی تھی اُس نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالی۔ اس نے پھر اپنی چچازاد بہن سے شادی کر لی اور اپنے دلی مقصد سے شاد و بامراد ہُوا۔ آخر میں وہ اسلامی فوجوں کی معیت میں قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں پچاس ہزار رومی کام آئے اور قسطنطنیہ پر اسلامی قبضہ ہوگیا۔"

ابنِ جُبیر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو نکل آئے۔

"تو کیا یہ سچ ہے کہ خدا نے رُوم مسلمانوں کو دے دیا اور اللہ کے برگزیدہ بندے کی کہی ہوئی باتیں آخر سچ ہوگئیں۔ خدا اسی طرح مسلمانوں کو ہر مُلک میں صلیب کے پُجاریوں پر فاتح اور غالب کرے۔"

"یہ سچ ہے۔" عبدالمسیح بولا "اور اب بادشاہ ولیم قسطنطنیہ کی طرف یہ بیڑا اس لیے بھیج رہا ہے کہ اس کی فوج اسے مسلمانوں سے چھین لے۔ اور وہ اس لڑکے کو روم کے تخت پر بٹھا دے۔"

"خدا اس عیسائی کے ناپاک ارادے کو ختم کرے۔ خدا اس کے بیڑے کو سمندر میں غرقاب کر دے!"

ابنِ جُبیر نے جوش سے کہا۔

اُنھوں نے عبدالمسیح سے عمینوئل کے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا "وہ ایک نوجوانی کی نازک شاخ ہے۔ گلابی رنگت، چھریرا بدن۔ اپنی شخصیت میں ایک شاہانہ جوت لیے ہوئے وہ اپنے اتالیق سے بڑی محنت سے عربی زبان پڑھتا ہے۔ اور اپنی کمسنی اور خامکاری کے باوجود عقلمند ہے۔"

واپس آکر ابنِ جُبیر نے اپنے کرانیکل میں لکھا "یہ خبر اگر سچ ہے، اور خدا کرے یہ سچ ہو، تو یہ دُنیا کے سب سے بڑے معجزوں اور موعودہ کرامات میں سے ہے۔ یہ روزِ قیامت کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ہے۔" مگر افسوس یہ خبر سچ نہ تھی۔ اور مسلمان قسطنطنیہ میں داخل نہ ہوئے تھے۔

"شہر میں اپنے قیام کے دوران میں ہم نے اس جزیرے کے مسلمانوں کی حالت کے متعلق بڑی پُر درد باتیں سُنیں کہ جن کو سُن کر خُون کھولنے لگتا تھا۔ صلیب کے پُجاریوں کا اُن سے سلوک (خدا انھیں غارت کرے)۔ ان کی ذلّت اور گراوٹ۔ عیسائیوں اور بادشاہ کے جبر کے تحت ان کی غلامانہ حالت! یہ سب باتیں ہمیں غم کے آنسو رُلاتیں۔ مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنایا جاتا اور ان کی عورتوں اور بچوّں پر الحاد کی سیہ بختیاں اور صعوبتیں ٹوٹتیں۔ بادشاہ بعض وقت اپنے مسلمان شیوخ کو اُن کا دین چھڑانے کے لیے طاقت بھی استعمال کرتا۔ انہی سالوں میں اسلامی فقہ کے ایک علاّمہ کے ساتھ اس جابر بادشاہ کے دارالسلطنت میں جو کچھ بیتی اس کا قصہ سنو۔ اس کا نام ابن زرعہ ہے اور وہ بادشاہ کے افسروں کے زور و جبر سے اس درجہ مجبور ہوا کہ اس نے اسلام سے اپنے انحراف کا اعلان کر دیا۔ اور دین مسیحی میں غرق ہوگیا۔ اس نے بڑی محنت سے "نئے عہد نامے"

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو ازبر کیا۔ رومیوں کے رسم و رواج کا مطالعہ کیا۔ ان کی شریعت کا علم سیکھا۔ یہاں تک کہ اسے اساقفہ کی اس جماعت کا رُکن چُن لیا گیا جو عیسائیوں کے مابین مقدمات کی سماعت کرتے تھے (ایک قسم کا ہائی کورٹ!)۔ جب کوئی مسلمانوں کا مقدمہ عدالت کے رُوبرو آجاتا تو وہ اپنے فقۂ اسلامی کے سابق علم کی بنا پر اس کا فیصلہ سُنا دیتا اور اس طرح دونوں قوانین کے تحت مقدموں میں اس سے مشورہ لیا جاتا۔ اس شیخ کی ملکیت میں اس کے مکان کے سامنے ایک مسجد تھی جسے اُس نے کلیسا بنا دیا۔ خدا ہمیں الحاد اور جھوٹے راستوں کے نتائجِ بد سے محفوظ رکھے۔ اس سب کچھ کے باوجود ہم نے یہ سُنا کہ وہ اپنے اصلی مذہب کو چھپائے ہوئے تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس نے اس رعایت سے فائدہ اُٹھایا ہو جو خدا کے ان الفاظ میں ملتی ہے کہ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ ۝ (ماسوا اس کے کہ جو جبر کی وجہ سے بظاہر تو اسلام سے ہٹ گیا۔ تاہم وہ دل میں ایمان رکھتا ہے)

"ان پچھلے چند دنوں میں اس شہر میں اس جزیرے کے مسلمانوں کا رہنما اور امیر قائد ابوالقاسم ابنِ حمُّود معروف بہ ابن الحجر وارد ہوا۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ ایک راستباز اور حق پرست شخص ہے جو نیکی کی روش پر چلتا ہے۔ اپنے بھائیوں کی تڑپ رکھتا ہے اور اسیروں کو رہا کرانے اور دُوسرے خیراتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہے۔ اس کی آمد پر شہر میں بڑا غُل مچا۔ وہ حال میں جابر ولیم کے زیرِ عتاب آیا تھا جس نے اسے اس کے مکان میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے تھے کہ وہ الموحدین سے خط و کتابت کرتا ہے۔ بادشاہ اسے مروا دیتا۔ لیکن کسی بات نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ اس کی تیس ہزار مُومنی دیناروں کی مالیت کی جائیداد غصب کر لی گئی جو عیسائیوں کو کھلتی تھی۔ اب وہ مکان اور دولت سے محروم ہو گیا۔ پھر اس جابر نے اس پر نظرِ عنایت کی اور اسے اپنی

حکومت میں منصب دے دیا۔ مگر وہ اپنے محکمانہ فرائض کی بجا آوری ایک غلام کی طرح کرتا۔ وہ اطرابنش میں آیا تو اس نے ہم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم اس سے جا ملے اور اُس نے مجھ سے کہا: میں نے اکثر خواہش کی ہے کہ مجھے کوئی غلام بنا کر لے جائے اور کسی دوسرے مُلک میں فروخت کر دے۔ مجھے اور میرے اہل و عیال کو بھی۔ شاید یہ بِکری ہمیں اس حالت سے کہ جس میں ہم ہیں نجات دلا دے اور شاید ہم اسلامی سرزمینوں میں فروخت ہوں، ذرا اس صورتِ حالات کا تصوّر کرو۔ جس میں یہ شخص اپنی اتنی تکریم اور بلند مرتبے۔ اپنے خدم و حشم، اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے باوجود اسے ہزار درجہ ترجیح دیتا ہے کہ وہ غلام ہو کر کہیں فروخت ہو جائے اور اسلامی آسمانوں کے نیچے سانس لے .... ہم اس سے رخصت ہوئے تو ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ تو زار و قطار روتا تھا ..... اس جزیرے کے مسلمانوں کے ہزارہا دوسرے لوگوں میں ایک تو خاص طور پہ بے حد دُکھ دینے والا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے بیٹے۔ بیوی یا بیٹی پر کسی وجہ سے خفگی کا اظہار کر بیٹھے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ناخوشی کا نشانہ بننے والی ہستی خود کو ہٹیلے پن میں آکر کلیسا کی نذر کر دیتی ہے۔ اور وہاں بپتسمہ لے کر عیسائیت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر باپ کے لیے اپنے بیٹے یا ماں کے لیے اپنی بیٹی کو پانے یا اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا اور وہ رو دھو کر بے بس بیٹھ جاتے ہیں۔ سِسلی کے مسلمان اس کے لیے اپنے اہل و عیال سے سلوک کے معاملے میں بڑے محتاط رہتے ہیں۔ اور ان کو اولاد پر غصّہ بھی آتا ہے تو حتی الامکان پی جاتے ہیں کہ کہیں اور گُل نہ کھلے اور وہ ان سے محروم ہو جائیں۔ ان میں سے جو عاقبت اندیش ہیں وہ ڈرتے ہیں کہ یہ بڑا غم ان سب پر پیش آنے والا ہے اور وہی کچھ ہو گا جو پہلے جزیرہ کریٹ میں مسلمانوں کے ساتھ گزر چکا ہے۔ کریٹ میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

عیسائی استبداد کی متواتر اذیتوں سے مسلمان اتنے مجبور و بدحال ہوئے کہ سب کو عیسائیت قبول کرتے ہی بنی۔ گو چند نفوس جن پر خدا کا فضل تھا بچ گئے۔ لیکن تعذیب کا کوڑا ان ملحدوں پر پڑے گا۔ خدا واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔

ابوالحجر کی عزت اور حیثیت مسلمانوں میں اتنی نمایاں ہے کہ عیسائی کہتے ہیں کہ اگر وہ عیسائیت میں داخل ہو جائے اور بپتسمہ لے لے تو جزیرے کے سب مسلمان اس کی پیروی میں عیسائی ہو جائیں گے ...... ان کی قابلِ رحم حالت کی ایک اور مثال ہمارے مشاہدے میں آئی۔ اطرابنش کے اس شہر کے ایک معزز آدمی (مسلمان) نے اپنے بیٹے کو ہمارے حاجی رفیقوں میں سے ایک کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "اے شیخ! میری ایک بیٹی کنواری باکرہ ہے جو سنِ بلوغت کو پہنچا چاہتی ہے۔ اگر وہ تمھیں پسند آئے تو تم اس سے نکاح کر لو۔ ورنہ میں اس کی شادی تمھارے ہموطنوں میں سے کسی اور کے ساتھ کرنے کو تیار ہوں جو اس پر راضی ہو۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ اپنے باپ اور بھائیوں کو چھوڑ کر چلی جائے گی اور اس طرح الحاد کی ترغیبوں سے بچ جائے گی۔ میری یہ خواہش ہے کہ وہ مسلمانوں کے دیسوں میں جا رہے۔" لڑکی کے والدین اس بات پر یوں تیار تھے کہ انھیں اُمید تھی جب سسلی سے باہر جانے پر روک ہٹالی جائے گی تو وہ بھی یہاں سے مسلمان ملکوں کو بھاگ جائیں گے۔ ہمارے حاجی رفیق نے ازراہ ہمدردی اور جنت کے انعام کا مستحق بننے کی خاطر اس بات کی ہامی بھر لی اور ہم نے ایسے موقع سے فائدہ اٹھانے میں اس کی مدد کی جس میں دُنیا اور عاقبت دونوں جہانوں کی راحتیں اور مزے حاصل ہوتے تھے!"

مجھے یقین ہے کہ اگر وہ لڑکا پیغام لے کر ابنِ جُبیر کے پاس آتا تو وہ بھی اسے بظاہر کچھ سوچ اور تامل کے بعد قبول کر لیتا۔ احمد بن حسّان کو اپنے حاجی رفیق کی خوش بختی پر بہت رشک آیا ہوگا!

ذوالحج کا نیا چاند نکلا۔ انھوں نے اُسے نہیں دیکھا کیونکہ آسمان پر کوندتے گرجتے بادل تھے اور وہ

طوفانی موسم کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

آخر بُدھ وار نو ۹ ذوالحج اور فرنگی مہینے کی ۱۳ مارچ کو وہ اپنے جہاز پر سوار ہوئے۔ وہ روشن دوپہر میں کشتیوں میں بیٹھ کر جہاز میں پہنچے۔ اور ہر ایک نے انھیں جاتے دیکھا۔ یا تو ناظم شہر بڑا دلیر آدمی تھا جو اس طرح کُھلم کُھلا بادشاہ ولیم کے فرمان کو کہ کوئی جہاز بیڑے کی روانگی سے پہلے سسلی سے نہ چلے نظر انداز کرنے کی جرأت رکھتا تھا اور یا مغرب اور اُندلس جانے والے جہاز بادشاہ کے حکم سے مستثنیٰ تھے۔ بہرحال انھیں کسی نے نہ ٹوکا۔

۲۱ ذوالحج کی صبح کو ہوا جہازوں کے لیے موافق تھی۔ درخشندہ صبح کے حُسن میں اور سمندری جواص کی کرلاہٹوں کو کانوں میں لیے وہ اطرابنش بندرگاہ کے زمرّدیں سے باہر نیلے سمندر میں نکلے۔ اطرابنش سے اٹھارہ میل دُور الراہب کے جزیرے میں جہاز نے پھر پناہ لی کیونکہ ہوا ان پر اُلٹ گئی۔ وہیں حُسنِ اتفاق سے جنیوا کے مرکون نامی کپتان کا جہاز لنگر کیے ہوئے اُنھوں نے پایا جو اسکندریہ سے آتا تھا اور جس پر دو سو سے زیادہ ان کے ہم وطن مغربی حاجی تھے۔ وہ ان ساتھیوں سے مکّہ معظمہ میں ایک سال پہلے جُدا ہوئے تھے۔ اور اب ان کا اس طرح الراہب کی سنسان بندرگاہ میں آنکلنا واقعی عجیب تھا۔ دنیا انھیں اس وقت بڑی چھوٹی جگہ معلوم ہوئی ہوگی۔ ان حاجیوں میں غرناطہ کے شہریوں کی بھی ایک جماعت تھی جن میں ان کا مکّہ کا رفیق اور مہمان فقیہ ابو جعفر ابن سعید بھی موجود تھا۔ جب اُنھیں پتہ لگا تو وہ اپنے جہاز کی دیواروں اور رسّوں سے چمٹ کر انھیں تکنے لگے۔ وہ بلند آواز میں اپنی خیریت اور ملاقات کی خوشخبری ابنِ جُبیر پارٹی کو دیتے تھے اور اس ملاپ پر فرطِ انبساط سے روتے تھے اور اس خوش بختی پر حیرت کرتے تھے۔ عید البقر کے بعد یہ گویا ان کے لیے ایک اور عید تھی!

مہینے کی بائیس ۲۲ کی رات کو خدا نے انھیں موافق ہوا عطا کی۔ کل چار جہاز الراہب میں سے پُرسکون تاروں بھرے تلے چُپکے سے نکلے اور ساحلِ اُندلس کی سمت روانہ ہوئے۔ سارا دن وہ ایک اچھی ہوا کی مدد سے سفر کرتے رہے اور ان کی اُندلس کے لیے تمنّاؤں نے گویا ہوا کی جگہ لے لی۔ دو دن کے سفر کے بعد ہوا پھر اُلٹ کر مغرب کی ہوگئی اور جہاز کو ہانکتی پھر الراہب میں لے آئی۔ اگلے دن وہ اکیلے ہی وہاں سے چلے (باقی جہاز بندرگاہ کی حفاظت میں لنگر انداز رہے)۔ بندرگاہ سے نکلتے ہی ایک تند مزاج طوفانی ہوا اُن پر جھپٹی اور مہینے کی ۲۷ تاریخ کو وہ سردانیہ کے جزیرے کی نوک پر تھے۔ اور ایک چکرا دینے والی تیز رفتاری سے اس کے پاس سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

AF-467

گزر گئے۔ ایک دن اور دو راتوں میں (یعنی چھتیس گھنٹوں میں) ان کے جہاز نے پانچ سو میل طے کر لیے تھے — ایک جدید پی اینڈ او پسنجر لائنر بھی چھتیس گھنٹوں میں آج کل اپنی سولہ سترہ ناٹ کی رفتار سے اتنا فاصلہ طے نہیں کر سکتا۔

پھر یہ موافق ہَوا بند ہو گئی۔ ایک اور ہَوا چلی اور اُنھیں شمالی افریقہ کی سمت لے گئی۔ ۲۸ ذوالحج کو ان کے جہاز نے جزیرہ خالطہ پر لنگر ڈالا۔ یہاں سے وہ افریقہ کا ساحل دیکھ سکتے تھے۔ چار دن وہ اس بندرگاہ میں ٹھہرے رہے کیونکہ ٹاپو کے باہر سمندر کی بھوکی موجیں طوفان میں بپھری ہوئی گرجتی اور دھاڑتی تھیں۔

اُنھوں نے محرم کا چاند بھی بادلوں کی وجہ سے نہ دیکھا۔ دوسرے دن یعنی جمعہ کی رات کو مشرقی ہوا چلی۔ اور وہ خالطہ سے رُخصت ہوئے۔ ہَوا پہلے سُبک اور لطیف تھی۔ پھر یہ تندی اختیار کر گئی۔ دو دن وہ تیزی سے سفر کرتے رہے۔ سردانیہ کو اپنے دائیں ہاتھ چھوڑتے ہوئے گزرے۔

سنیچر دس محرم کو جزیرہ یابسہ کا ساحل ان کو دکھائی دیا۔ اور اگلی صبح جہاز نے اس میں لنگر ڈالا۔ جہاز دو سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان ٹھہرا جن میں سے ایک کا نام "بوڑھا" تھا۔ دوسری کا "بڑھیا!"

شام ڈھل رہی تھی کہ اُنھیں اُندلس کی پہاڑیاں نظر آئیں۔ وہ انھیں تمنّا اور شوق محبّت کی نظروں سے بار بار تکتے تھے۔ انھیں ایسا لگا کہ ساری دُنیا میں اُندلس کی پہاڑیوں جیسی اور کوئی پہاڑیاں نہیں ہیں۔ اب بھی تین چار دن جہاز پر اور تھے۔ اور جمعرات محرّم کی پندرہ کو شام کے وقت وہ قرطاجنہ کی بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ ان کی مسرّت کو کون بیان کر سکتا ہے۔

"اور ہم سولہ تاریخ کو جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد سے چلے۔ رات قرطاجنہ کے علاقہ میں ایک بُرج میں بسر کی جسے تین حوضوں کا بُرج کہتے ہیں۔ وہاں سے مرسیہ، لبرالہ، لورقہ، المنصورہ اور وادی آش ہوتے ہوئے بائیس محرّم جمعرات کے روز (۲۵ اپریل ۱۱۸۵ء کو) ہم غرناطہ میں اپنے گھروں میں واپس آئے۔

ع "اُس سیمیں نازنین نے اپنا عصا آخر پھینک دیا
اور وہ یوں کھڑی تھی جیسے ایک یاتری اپنے سفر کے خاتمے پر!"

toobaa-elibrary.blogspot.com